ایک سفر
اپنے
مُراد
کے
ہمراہ

مقصود الحسن عظیمی

ممتا کے اُس روپ کے نام ۔۔۔

جو ماں سے معبود تک کے سفر میں'

میرے مراد کی صورت

مجھ پر محیط ہے

دیباچہ

انسان کے اس دنیا میں آنے کے بعد ایک نظام قائم ہوا۔ انسان اس نظام میں بندھا ہوا ہے۔ ایک نظام ہی کے تحت انسان اپنا تجربہ، اپنا علم، اپنا ہنر اور اپنی طرز فکر کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرتا چلا جاتا ہے۔

علم سیکھنے کے لئے ہم سکول، کالج، مدرسے، مکتب اور یونیورسٹیوں میں جاتے ہیں۔ ڈاکٹر بننا ہو، انجینئر بننا ہو، حکیم بننا ہو، اکاؤنٹینٹ بننا ہو، وکیل یا قانون دان بننا ہو تو ہم اس سے متعلق سکول یا کالج یا تعلیمی ادارے میں داخل ہوتے ہیں۔

ان تعلیمی اداروں میں اساتذہ کرام ہمیں اس متعلقہ علم سے روشناس کرواتے اور اس کے استعمال سے آگاہ کرتے ہیں۔ لیکن اس کو کس ذہن سے استعمال کرنا ہے کیسی سوچ اور کیسی طرز فکر سے استعمال کرنا ہے۔ یہ بات کم ہی بتائی جاتی ہے۔ اس علم کو استعمال کرنے میں اس کو زیادہ سے زیادہ منافع بخش بنانے کی سوچ البتہ ہمیں ہمارے معاشرے سے منتقل ہوتی ہے۔

خانقاہی نظام تعلیم میں علم ایک چیز ہے اور طرز فکر، سوچ یا ذہن جس کے مطابق وہ علم استعمال ہونا چاہیے ایک دوسری چیز ہے۔ یہاں طرز فکر کو علم سے زیادہ ضروری اور اہم گردانا جاتا ہے۔ ہم کسی علم کو کیسے استعمال میں لائیں گے۔ کس سوچ کے تحت استعمال کریں گے یہ سب طرز فکر ہوا اور طرز فکر سیکھنے سکھانے سے زیادہ منتقل ہوتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ماں باپ کی طرز فکر اولاد کو منتقل ہوتی ہے اور اولاد سکول، کالج یا یونیورسٹی سے علم حاصل کرنے کے بعد اسی علم کو اسی طرز فکر کے

مطابق استعمال کرتی ہے جو اس کو اس کے والدین سے منتقل ہوئی ہوتی ہے۔

طرزِ فکر کی منتقلی میں ذوق و شوق کے علاوہ قربت کا بھی بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ روحانی علوم کے جویا کو اس قرب کی خاطر اس کا روحانی باپ اپنے قریب کرتا ہے تا کہ وہ اس کے روز و شب کی مصروفیات، اس کے اندازِ فکر، اس کے طرزِ استدلال اس کی سوچوں اور اس کے طرزِ عمل کا مشاہدہ کر سکے اور اس کو اپنی عملی زندگی میں اس جیسا انداز اپنانے میں سہولت حاصل رہے۔

زیرِ نظر کتاب میں ایک مرید اپنے مرآد کے ہمراہ رہنے کے بعد اس قربت کا حال سنا رہا ہے جو اس کو اس کے مراد نے عطا فرمائی۔ اس احوال سے جہاں مرشد کے انداز تربیت کے دلنشین پہلو سامنے آتے ہیں وہاں اس طرزِ فکر کا بھی پتہ چلتا ہے جو ایک روحانی شخصیت کو حاصل ہوتی ہے۔ مصنف اس لحاظ سے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے مراد کی قربت میں جو موتی سمیٹے وہ انہوں نے راقم الحروف کی فرمائش پر ہم سب کے سامنے رکھ دیے ہیں۔

میاں مشتاق احمد عظیمی لاہور

5-12-1996

بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو مل کر بے خودی کا کیف تجربے میں آتا ہے۔ ان سے ملاقات پر آپ کی عجیب حالت ہو جاتی ہے۔ آپ اپنی کیفیات میں لطف و انبساط کا تاثر نمایاں طور پر محسوس کرتے ہیں۔ تمام تر بے خودی کے باوجود احترام کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھٹتا اور آپ خود کو ان کی طرف کھنچتا ہوا بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہ کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ احترام میں فاصلے کی بجائے قربت اور وارفتگی میں عقیدت گھل جاتی ہے۔ ان میں کچھ ایسی خداداد صفت ہوتی کہ وہ آپ کو خود آپ سے دور ہٹا کر اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔

جب آدمی کی توجہ خود سے ہٹتی ہے تب وہ دوسروں کو دیکھنا اور محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جب آدمی اپنی ذات کے محدود کے حصار سے باہر نکل آتا ہے تو اس کو یہ دنیا ایک مختلف رنگ، ایک بدلے ہوئے ڈھنگ اور ایک نئے زاویے سے نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔ جب آنکھوں پر چڑھے شیشے کا رنگ تبدیل ہو جائے تو اس تبدیلی کا سبب مسکرا دیتا ہے۔ ان کی یہ مسکراہٹ اتنی گہری، پُر زور اور جاندار ہوتی ہے کہ آپ بے خود ہو جاتے ہیں اس مشفقانہ پناہ کا بھرپور احساس دلانے والی مسکراہٹ کے ملکوتی حسن میں کھو جاتے ہیں۔ آپ کو اپنا آپ بھول جاتا ہے۔ آپ کے دھیان میں موجود ہر چیز اس مسکراہٹ کی لپیٹ میں آ کر معدوم ہو جاتی ہے۔ دھیمے اور کومل سروں کی یہ مسکراہٹ اتنا ہلکا پھلکا کر دیتی ہے کہ آپ کو اپنا وجود فضا میں تیرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ غم دھواں ہو کر اڑ جاتے ہیں۔ آپ کو اپنی کوئی پریشانی، کوئی فکر، کوئی الجھن یاد نہیں رہتی۔ آپ کے ہر رنج ہر دکھ کو وہ اپنے بہاؤ کے زور سے آپ سے دور کر دیتے ہے۔ آپ اس مسکراہٹ میں کھو جاتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ وہ مسکراہٹ ہونٹوں سے اتر کر آپ کے اردگرد پھیلتی چلی جا رہی ہے اور اس نے ہر طرف سے آپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ آپ اس مسکراہٹ کی گود میں جا بیٹھتے ہیں۔ وہ مسکراہٹ آپ کے اندر اتر جاتی ہے۔ آپ خود بھی مسکرا دیتے ہیں اور اس پھیلتی بڑھتی مسکراہٹ

کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ مسکراہٹ کسی بھی طور ان وقتی اور لمحاتی مسکراہٹوں جیسی نہیں ہوتی جن سے ہم اکثر و بیشتر دوچار ہوتے ہیں۔ یہ عارضی نہیں ہوتی۔ مستقل اور پائیدار ہوتی ہے۔ منظر سے ہٹنے کے بعد بھی یہ آپ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ آپ اس کو ساتھ رکھنے پر آمادہ ہوں تو یہ آپ کو لذّ لذاتی اور مسرور کرتی ہے۔ آپ یہ جان لیتے ہیں کہ اس مسکراہٹ کا تعلق خوشیوں کے اس گروہ سے ہے جو حقیقی ہیں۔ یہ مسکراہٹ ان مسرتوں کی آئینہ دار ہوتی ہے جن کا تعلق سرور سے ہوتا ہے۔ اس سرور سے جو آپ کی رگ رگ میں پھیل کر آپ کو ہلکورے لینے پر مجبور کرتا ہے۔ مستی کا ایک پیڑ آپ کے من کے آنگن میں اگتا، بڑھتا اور پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔

ایک بار میں بھی ایک ایسی ہی مسکراہٹ سے دوچار ہوا تھا۔ آج سالوں بعد بھی ان لمحات کی سرور انگیزی اتنی تازہ اور نئی سی لگتی ہے گویا کل ہی کی بات ہو۔ ان کیف آور لمحوں کی یاد آتی ہے تو آج بھی میرا تن ہلکورے لیتا اور من ڈولنا شروع کر دیتا ہے۔ اس وقت جب میں نے بااندازِ آٹوگراف لیتے ہوئے اپنے نام میں ''عظیمی'' کے اضافے کی درخواست کی تو ایسی ہزاروں درخواستوں پہ ''اجازت ہے'' لکھنے والے نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور مسکرا دیا۔ اس مسکراہٹ نے کشش ثقل کو ختم کر دیا۔ میں نے ایک بے وزنی کی کیفیت میں ایک نئے عالم، ایک نئے جہاں اور ایک نئی دنیا کو اپنے سامنے طلوع ہوتے

دیکھا۔میری سابقہ زندگی زلزلے کی زد میں تھی اس میں دراڑیں پڑ رہی تھی۔وہ مسمار ہو رہی تھی۔ہر شے فنا سے دوچار تھی۔ جب میاں مشتاق احمد عظیمی اور نیاز احمد عظیمی نے ''مبارک ہو'' کہا تو مجھے لگا کہ اک راہ گم کردہ مسافر صحرا کے سفر میں اپنی منزل مراد تک ایک ہی ہلے میں پہنچ گیا ہے۔اب میرے سامنے ایک واضح منزل تھی۔۔۔میری منزل۔۔۔اور میں اس منزل کی طرف اپنے مراد کی انگلی تھامے نکلتا ہی چلا گیا۔

اس نئی زندگی میں میں بارہا سفر در سفر کی کیفیت سے گزرا۔کبھی اس سفر کا آغاز تنہائی میں ہوتا اور میرا مراد نفس کے اونٹ کو ایک سار بان کی طرح عقل و دانائی کے سرابوں سے بچاتا، صحراوں کے بے نشان راستوں پہ چلاتا مجھے انفس و آفاق کی سیر کراتا اور میں ''نک نک دیدم۔۔۔دم نہ کشیدم'' کی تصویر بنا یہ سب کچھ دیکھا کرتا۔

ایک بار دیکھا کہ میں ایک چھوٹا سا بچہ ہوں۔یہ بچہ اپنے باپ کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہے۔باپ کی نظریں افق کے پار جمی ہوئی ہیں اور بچے کی نگاہیں باپ کے نقوش پا کی تلاش میں باپ کی ایڑیوں پر۔وہ اپنے ننھے قدم باپ کے نقوش پا پر رکھنے کی کوشش میں کبھی کامیاب ہوتا اور کبھی ناکامیاب۔باپ بظاہر اپنے پیچھے آتے بچے کے اس شغل سے بے خبر قدم بڑھائے چلا جا رہا تھا۔ لیکن بباطن خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ بچے کی یہ حرکت ایک نہ ایک دن اس کو اس کے نقش قدم پر چلنا سکھا ہی دے گی۔ بچے جب اپنے والد کے

چیلے اپنے گرو کے اور مرید اپنے مراد کے قدموں کے نشانات کا سراغ رکھتے ہیں تو سعادت مند کہلاتے ہیں۔ ان کی سعادت مندی انہیں منزل مراد سے قریب اور قریب کرتی چلی جاتی ہے۔ منزل کے قرب کا احساس راہبر کو سرشار کر دیتا ہے۔

ایک دن لاہور مراقبہ ہال (جامعہ عظیمیہ) کے باہر کچھ ایسے ہی سرشار لہجے میں میرا مراد اپنے مرید سے گویا ہوا۔

''اللہ میاں کس قدر خوبصورت ہیں۔ کس قدر پیارے ہیں۔''

اس وقت چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ چاند کا سفر پورن ماشی کی طرف جاری تھا۔ چاندنی کا ایک اپنا ہی مسحور کن سا تاثر ہوتا ہے۔ میٹھا میٹھا سا۔ کول کول سا۔ اپنے اندر ایک مدھرتا لئے۔ ہم رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی میں قرب مراد کے علاوہ چاندنی کا بھی لطف اٹھا رہے تھے اور یہ لطف کھانے کے خمار پر بھاری پڑ رہا تھا۔ ذہن رات کے حواس کی گرفت میں آزادی کی کروٹیں لے رہا تھا۔ مراد کی میٹھی اور مدھر آواز ہمیں اللہ کی صناعی اور اس کے انعامات کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

''انسان اللہ تعالیٰ کے انعامات پر غور کر کے تو دیکھے۔ آپ اپنے جسم کو ہی لے لیں۔ اس کی روزانہ مرمت، ماہانہ دیکھ بھال، سالانہ اوور ہالنگ کا حساب لگائیں۔ سر کے بالوں سے لیکر پاؤں کے ناخنوں تک ـــــ جسم کے ایک ایک عضو کی بناوٹ کی قیمت کا تخمینہ

تو چھوڑیں ایک طرف۔ والو تب لگائیں جب آپ انہیں بنانے پر قادر ہوں۔۔۔صرف ان اعضا کی دیکھ بھال اور روٹین اینکشن کے لئے ڈاکٹروں کی فیسوں اور اخراجات کے تخمینہ کا اندازہ کرنے کو میں نے حساب لگایا۔۔۔ دل کے سرجن، پھیپھڑوں کے ماہر، ہڈیوں کے معالج، خون کے مختلف ٹیسٹوں، گردوں اور دیگر اعضا کی صفائی کی روزانہ فیس اور ان کی دیکھ بھال پر اٹھنے والے اخراجات کا اندازہ ایک کروڑ روپے روزانہ نکلا۔ کھانا، پینا، کپڑا، مکان، تعلیم و تربیت، رہن سہن سب کچھ اس کے علاوہ۔ اللہ تعالٰی کے ان انعامات کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کبھی اللہ میاں مل جائیں تو انہیں خوب پیار کیا جائے۔''

وہ لوگ جنہیں گفتگو کا بہت ملکہ حاصل ہو جب بات کرتے ہیں تو ذہن متحرک ہو کر تصویر کشی میں مصروف ہو جاتا ہے لیکن جب فقیر بات کرتا ہے تو موضوع کے حوالے سے تمام تاثرات زندہ اور احساسات متحرک ہو جاتے ہیں۔ ذہن صرف تصویر ہی نہیں دیکھتا تصویر سے متعلق ماحول میں اتر جاتا ہے۔ کہی جانے والی گفتگو کی کیفیات ذہن پر وارد ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ اسی لیے فقیروں اور قلندروں کی گفتگو کی کیفیات عام آدمی کی گفتار سے یکسر مختلف ہوتی ہیں۔ انہیں سن کر بندہ سنتا ہی نہیں دیکھتا اور محسوس بھی کرتا ہے۔ جونہی میرے مراد نے فرمایا ''کبھی اللہ میاں مل جائیں تو انہیں خوب پیار کیا جائے''۔ ہمارے ذہنوں میں پیار ہی پیار بھر گیا۔ من مندر میں پیار کی جوت جھلملائی۔ پیار

نے مجسم ہو کر انگڑائی لی اور باہیں لمبی کر کے انہیں اللہ کی طرف دراز کر دیا۔ میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب نے سوال کیا "تو کیا پیار کرنا شکر ہوا؟" فرمایا! "جی ہاں۔۔۔ قرب ہوا۔"

اور بتانے لگے "حضور قلندر بابا اولیاؒ کو اللہ تعالیٰ سے اس قدر قربت حاصل تھی جیسی بے تکلف دوستوں میں ہوتی ہے۔" اور پھر بات کا سرا وہیں سے جوڑتے ہوئے فرمایا۔ "بندے پر، کوئی احسان کر دے تو وہ ساری عمر نہیں بھولتا۔ لیکن اس کے باوجود ہم اللہ ہی کا شکر نہیں کرتے۔" رات کے اس سناٹے میں جب میرا مراد بولتے بولتے خاموش ہوا تو میرے اندر ایک آواز گونجی "ہم اللہ کے انعامات کو احسان مانتے ہی کب ہیں۔ احسان مان لیں، تو مرتبہ احسان ہی حاصل نہ ہو جائے" مرتبہ احسان کی اپنے اندر ابھرتی اس توجیہہ کو سن کر میں نے چونک کر اپنے مراد کی طرف دیکھا۔ وہ اسی قلندرانہ بے نیازی سے جھومتے جھامتے خوشیوں کو اپنے جلو میں لئے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ میں نے جذبہ احسان مندی کو عقیدت میں ڈھل کر اپنے مراد کے قدموں سے لپٹتے دیکھا۔

اس عقیدت کی تشریح کرتے ہوئے ایک بار میرے مراد نے کہا تھا۔ "اللہ تعالیٰ دنیا کو چلانے کے لئے درکار سسٹم کے تحت حاکموں اور بادشاہوں کے لئے لوگوں

کے دلوں میں رعب، علم والوں کے لئے احترام اور روحانی لوگوں کے لئے عقیدت ڈال دیتے ہیں اور پھر یہ جانتے ہوئے کہ قرب کے خمار کے زیر اثر احترام اور عقیدت میں تمیز نہیں کر پا رہا۔ فرمایا ''احترام میں اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن عقیدت میں نہیں'' مرید نے سوچا شاید اس لئے کہ روحانی لوگوں میں حقیقت آشنائی ہوتی ہے اور حقیقت صرف ایک ہی ہوا کرتی ہے دو تین یا ہزاروں نہیں۔

سیر کرتے ہوئے جونہی پلٹے ہمارے پیچھے پیچھے آنے والی ایک ٹولی ہمارے سامنے آ گئی۔ میرے مراد نے سوالیہ انداز میں ان کو دیکھا۔ ایک صاحب نے تعارف کرایا۔ یہ حبیب صاحب ہیں اور یہ ۔۔۔ قدرے خاموشی رہی۔ جیسے حافظے میں نام ٹٹول رہے ہوں ۔۔۔ پھر کہا اور یہ سمیع اللہ۔ پشاور سے ۔۔۔''

میرے مراد نے کہا ''میں تو سمجھا تھا کہ آپ کہیں گے اور یہ محبوب ہیں۔ بھئی حبیب کے ساتھ تو محبوب ہی ہونا چاہیے۔'' بذلہ سنجی میں لطافت اور ندرت کی ادا کوئی ان سے سیکھے۔ ایک بار ایک صاحب نے بات کہنے کو کہا ''آج کل دل بہت آتے ہیں'' فرمایا ''آپ تو دلوں میں رہتے ہیں۔'' میرے مراد کا تو اضح کرنے کا اور اپنے بچوں میں بہتر طرز فکر ابھارنے کا یہ انداز نہ صرف دلنشیں ہے، بلکہ انتہائی موثر بھی۔

مراقبہ ہال (جامعہ عظیمیہ) لاہور میں سہ روزہ تربیتی سیمینار اور مراقبہ

بالوں کے نگراں خواتین حضرات کی میٹنگ تھی ۔ روشن نظر اور منور دل دوستوں کا روح پرور اجتماع تھا ۔ سب ایک ہی باپ کی روحانی اولاد ہونے کے ناطے آپس میں بہن بھائیوں کا سا تعلق اور لگاؤ محسوس کرتے ہوئے ایک دوسرے سے مل مل کر خوش ہو رہے تھے ۔ میاں مشتاق احمد عظیمی اور ان کے پر جوش اور مخلص ساتھی پورے ملک سے آئے ہوئے مہمانوں کی میزبانی میں سرگرم تھے ۔ فضا میں خوشبوؤں اور مسرتوں کے روح رواں سب کی توجہ کے مرکز ہم سب کے مرشد، ہادی اور مراد تھے ۔ ہم ان کو باتوں سے اپنی سماعتوں کی آبیاری کرنے، اپنے ذہنوں کو ان کے افکار کے موتیوں سے سجانے اور دلوں میں ان کے قرب کے احساس کو تازہ کرنے ہی تو اکٹھے ہوئے تھے ۔

خانقاہی نظام تربیت کا اعجاز ہے کہ آج علم سینہ کو باقاعدہ درس و تدریس کے انداز پر پڑھایا، سکھایا اور منتقل کیا جا رہا ہے ۔ روحانیت ایک باقاعدہ سائنس کی طرح تھیوری اور پریکٹیکل کے ساتھ پڑھائی اور سکھائی جا رہی ہے ۔ وہ علوم جن کو ٹائم اینڈ سپیس کے مروجہ پیمانوں سے نہیں پڑھایا جا سکتا یہاں رفتہ رفتہ طرز فکر میں تبدیلی کے عمل سے گزار کر ذہنوں میں راسخ کر دیئے جاتے ہیں ۔ طرز فکر میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت کا احساس بھی فقیر ہی دلاتے ہیں اور اس سے گزارنے والے بھی فقیر ہی ہوتے ہیں ۔ مکتب اور مدرسوں میں یہ فیضان نظر کہاں؟

سلسلہ عالیہ عظیمیہ کے تحت خانقاہی نظام کا احیا اس صدی کا سب سے زیادہ عظیم الشان کارنامہ کہہ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ایک طرف مادی قدار کی پرستش اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور دوسری طرف روحانی قدروں کا پھیلاؤ۔ قدرت نے ہر بار انسان کے بگاڑے ہوئے توازن کو درست کر کے اپنی فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے۔ خانقاہی نظام تدریس سے بہرہ مند ہونے والے خود کو اگر سعید جانتے اور اس خوش قسمتی پر ناز کرتے ہیں تو حق بجانب ہیں۔

مادیت کی چکا چوند سے نگاہیں چندھیا کر پتھرا گئی ہیں۔ قدریں بدلیں، روایات ٹوٹیں اور بکھر گئیں۔ بے ہنری کو کمال، صداقتوں اور کرامتوں کو ڈھکوسلہ کہہ کر دولت پرستی کا لبادہ اوڑھنے کے بعد اب اگر لوگ مضطرب، پریشان اور بیزار ہیں تو کیا غلط۔ ایسے میں --- جب ہر چہرہ ستا ہوا، کملایا ہوا، خشونت اور بیزاری کا آئینہ بنا ہوا نظر آتا ہو۔ شاداب، شگفتہ اور کھلکھلاتے چہرے اس پُر آشوب دور میں گلستان کا تاثر دیتے ہیں۔

بہن بھائیوں کے چہروں پر شفق رنگ شگفتگی اور شادابی کے ساتھ ساتھ معصومیت دیکھتے دیکھتے میرے ذہن میں شادابی اور شگفتگی کی اصل جاننے کا خیال گزرا۔ خیال کی لہر مراد کی سوچ سے ٹکرا کر پلٹی اور میرے ذہن میں آ کر الفاظ بن

گئی ـــ پیغمبرانہ طرزِ فکر ۔ دنیا پرستوں کو دیکھئے ـــ دنیا کی طرف لپکے چلے جاتے ہیں اور دنیا ہے کہ آگے ہی آگے بھاگی چلی جارہی ہے ۔ یہ جتنا دنیا کی طرف بڑھتے ہیں دنیا اسی قدر آگے ہی آگے بھاگی چلی جارہی ہے ۔ یہ جتنا دنیا کی طرف بڑھتے ہیں دنیا اسی قدر آگے کو کھسک جاتی ہے ۔ پیغمبرانہ طرزِ فکر سے فیض یافتہ انسان کی عجیب شان ہوتی ہے ۔ وہ دنیا سے عجیب سا رویہ رکھتا ہے وہ اسے برتتا ہے ۔ اس سے متمتع ہوتا ہے لیکن کیا مجال کہ یہ اس کے دل میں کوئی جگہ بنا لے ۔ دنیا کے عاشق دنیا کو دل میں بسانے کے جرم میں دنیا کی ستم کیشیوں کا شکار ہوتے ہیں تو ادھر فقیر اور دنیا کو دھتکارنے والے کو یہ اپنی آغوش وا کئے اسے اپنی طرف بلاتی ہے ۔ لیکن جب یہ دیکھتی ہے کہ یہ بندہ میرے جھانسے میں آنے والا نہیں تو خود اس کی طرف کھسکنا شروع کر دیتی ہے اور جو بندہ مومن کی فراست سے آراستہ ہو جاتا ہے تو یہ دنیا اس کا دل راضی کرنے میں لگ جاتی ہے ۔ اب یہ بندہ آگے آگے ہوتا ہے اور دنیا اس کے پیچھے پیچھے ۔

میں اپنے مراد کے ہمراہ جہاں کہیں بھی گیا ۔ جس شہر جس گاؤں کو بھی گیا ان کے وہاں پہنچتے ہی ایک چہل پہل اور رونق کا سماں بندھ جاتا ہے ۔ ان کی آمد کا باقاعدہ اعلان کیا گیا ہو یا نہ ۔ قرب و جوار کے لوگ ملنے ، علاج کرانے ، اللہ والے کی دعا لینے کھنچے چلے آتے ہیں ۔ ایک بار لاہور مزار قبرہ ہال میں بڑھتے ہوئے ہجوم کو دیکھ کر

تبصرہ فرمایا۔ ''میں تو جیسے گُڑ کی ڈلی ہوں۔ ان لوگوں کو تو گویا میری خوشبو آ جاتی ہے۔''
رجوعِ خلائق تبھی ہوتا ہے جب بندہ مخلوق کی خدمت کو مشن مان لے۔ مرشد کریم نے
ایک بار یہ فرمایا تھا کہ مشن میں فرزانگی کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ دیوانگی۔ نری دیوانگی
چاہیے مشن کو چلانے کے لئے۔

وہاں آئے ہوئے ایک صاحب میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب سے پوچھ
رہے تھے جب آپ کے پاس کتاب موجود ہے تو پھر آپ کسی انسان سے کیوں رجوع
کرتے ہیں۔ جب علم دستاویز کی صورت میں ہر جگہ دستیاب ہے تو پھر بندے کا سہارا
لینے کی کیا ضرورت ہے؟ میاں صاحب یوں تو مرنجان مرنج سے انسان ہیں لیکن اپنے
مرشد سے والہانہ لگاؤ نے انہیں اس وقت ابھار دیا۔ وہ کسی قدر جوش میں آ کر دلائل
دیئے چلے جا رہے تھے۔ ''جب اناٹومی کی کتب ہر گھر میں موجود ہیں تو آپ ہمیں کتاب
پڑھ کر اپنڈکس کا آپریشن کیوں نہیں کرنے دیتے؟ جب تعزیرات پاکستان عام دستیاب
ہے تو آپ مجھے وکیل پکڑنے کا مشورہ کیوں دیتے ہیں؟ آپ مجھے دسویں جماعت کی
Maths ہی پڑھ کر دکھا دیں۔ آپ نے پڑھ بھی لی، تو سمجھنے کے لئے بہر حال استاد کی
ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے وس پورہ دیکھا ہے۔ وہاں پہلی بار جانا ہو۔
یا تو کوئی آپ کو ساتھ لے کر جائے گا اور یا آپ پتہ پوچھ پوچھ کر پہنچیں گے۔ محض کتاب

میں وسن پورہ کا نام پڑھ کر بھی کوئی وسن پورے نہیں پہنچا۔"

وہ صاحب لاجواب ہو کر کج بحثی پر اترنے لگے تو میاں صاحب نے انہیں کھانے کی دعوت دی کہ آپ لنگر میں شامل ہوں یہ باتیں پھر کسی اور وقت سہی اور یہ کہ کر انتظامات میں مصروف ہو گئے۔

مرشد کریم کے پاس آنے والوں میں اکثریت ان کی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی پریشانی کا شکار ہوتے ہیں۔ کسی بیماری کا علاج کروانا ہوتا ہے۔ جادو ٹونے یا آسیب کا وہم ان کو ستا رہا ہوتا ہے یا پھر انہیں کسی الجھن کسی مخمصے نے ایسا جکڑا ہوتا ہے کہ ان کو نجات کی یہی صورت نظر آتی ہے کہ وہ کسی اللہ والے کے در پر حاضر ہوں۔ اس کی نظر کرم کے خواستگار ہوں، اس کی مجیب الدعواتی سے فیض یاب ہوں۔ اب یہ ایک عجیب بات ہے کہ جو بھی ان تک پہنچتا ہے اپنے یقین کے مطابق مراد پاتا ہے۔

لوگ اپنے مسائل، بیماریوں اور الجھنوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان تک آتے ہیں اور وہ محض مخلوق کی خدمت کے جذبے کے تحت ان کے مسائل کے حل میں کچھ اس طرح سے جتے رہتے ہیں کہ تھکن سے چور ہیں مگر علاج ہو رہے ہیں۔ خانگی اور نجی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے مگر مسائل حل ہو رہے ہیں۔ سوشل زندگی ختم ہو کر یہیں تک سمٹ گئی ہے اکثر صبح سے شام ہو جاتی ہے اور لوگ ہیں کہ باری کے منتظر۔ سینکڑوں مل لیتے

ہیں تو بیسیوں ابھی باقی۔۔۔ناچار انہیں اگلے روز آنے کا کہنا پڑتا ہے۔حالانکہ مریضوں کو نمٹانے کی رفتار اتنی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔مریض سامنے گیا۔نام پوچھا۔مریض نے حال سنانا شروع کیا آپ نے نسخہ لکھنا۔ادھر مریض کی روداد ختم ادھر نسخہ اس کے سامنے۔فرمایا ''مریض سے روداد تو محض اس کی دلجوئی کے لئے سنتے ہیں۔'' اس خدمت خلق کی اپنے روحانی فرزندوں کو تلقین کرتے ہیں تو فرماتے ہیں۔''اللہ سے دوستی کرنا ہو تو وہی کیجئے جو اللہ کرتے ہیں اور اللہ تو بندوں کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔''

دوسری قسم کے لوگ جنہیں میں اپنے مراد کے گرد منڈلاتے دیکھتا ہوں۔وہ ہوتے ہیں جنہیں مرشد کو دیکھنا، مرشد کی باتیں سننا اور خود کو کسی نہ کسی طور ان کی توجہ کے دائرے میں لانا یا اس کی میک وہ کرنا بہت بھلا لگتا ہے۔ایسے بھی لوگوں کو دیکھا ہے کہ ان کو محض ان کا نظر آ جانا ان کی تسکین کا باعث ہوتا ہے وہ دیدار مرشد سے خود کو سیراب کرتے ہیں۔اسی سے ان کی روحیں شانت ہوتی جاتی ہیں۔انہیں اپنے مراد کی قربت مست و بے خود کر دیتی ہے۔وہ اسی میں خوش ہوتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا کام کریں کہ ان کا مرشد ان کی طرف متوجہ ہو جائے۔جب وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔چہرے پر سکون کی لہریں جگمگانے لگتی ہیں اور محبت کی شعاعیں ان کے بشرے سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

ایک بار بات ہو رہی تھی۔ شریعت کے حوالے سے کہا کہ ''یہ سب بھی محدودیت ہے، آپ آخر جنت میں کیا کریں گے وہاں اتنی لمبی زندگی ہے نہ ختم ہونے والی وہ کیسے گزاریں گے یہ دماغ ساتھ جائے گا نہیں۔ وہاں کریں گے کیا؟ آخر کتنا سوئیں گے؟'' مجید صاحب نے کہہ دیا ''وہاں بھی آپ کی مجلس میں بیٹھیں گے۔ آپ کی باتیں سنیں گے'' سب ہنس دیئے۔ فرمایا ''آپ تو بہت حاضر جواب نکلے۔ لیکن میرا سوال اپنی جگہ بھئی وہاں کی زندگی کے لئے بھی تو کوئی مصروفیت ہونا چاہیے''۔ بعد میں مجید صاحب کی خوشی دیدنی تھی یوں لگتا تھا انہیں تو جنت ہی مل گئی ہو۔ مرشد سے بات ہو گئی۔ مرشد نے ان کو براہ راست مخاطب کر دیا تھا۔ وہ ایک اور ہی عالم میں تھے۔ جس بھائی سے مل رہے ہیں گلے لپٹا رہے ہیں۔ خوشی کے اظہار کا یہ بھی ایک انداز ہے۔

کچھ اصحاب کو میں نے اپنے مراد کے عشق کا شکار پایا۔ اس عشق کا شکار ہونے والے عجیب تو خیر نہیں مگر کچھ بدلے بدلے سے لگتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو مرشد کے قریب رہنے کو کاروبار، بیوی بچوں، عزیز و اقارب، دوست رشتے دار سب پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس عشق و محبت کے میں نے اس سفر میں بہت سے رنگ دیکھے ہیں کچھ ہلکے۔ کچھ گہرے اور کچھ کاٹ دینے والے۔

ایک صاحب بہت عرصہ بعد نظر آئے ان سے پوچھا۔ لا کو آئے اتنے دن

ہو گئے ۔ آپ نظر ہی نہیں آئے ۔' روہانسے ہو کر بولے ۔

'' کیسے آؤں ؟''

دریافت کیا'' کیوں کیا ہوا ؟''

کہنے لگے '' مجھ میں برداشت نہیں ۔ میں تاب نہیں رکھتا ۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی'' ۔

'' کیسی برداشت ۔ کیسی تاب اور کیسی سکت ؟ '' میں نے بہت حیرانی سے پوچھا ۔

فرمایا'' آپ صورت سے اتنے بھی سادہ نظر نہیں آتے ۔''

جب کوئی ایسی بات کہہ دی جائے جو میری سمجھ سے باہر ہو اور اگلا توقع کر رہا ہو کہ میں بن کہے سمجھ لوں گا تو میں گڑبڑا کر رہ جاتا ہوں ۔ سو اس وقت بھی یہی ہوا ۔ میں ان کے چہرے پر تڑخنے کے آثار تو دیکھ رہا تھا مگر سمجھ کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنے محبوب کے قریب آ کر بھی یہ اتنے ٹوٹے ٹوٹے سے کیوں لگ رہے ہیں ۔ عجیب سے لہجے میں فرمایا ۔

'' میں اپنے محبوب کا جلوہ برداشت نہیں کر سکتا ۔ مجھ میں اپنے علاوہ دوسرے عاشقوں کو برداشت کرنے کی تاب نہیں ۔ میں خود میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ حضور کے رو

بر و کھڑا رہ سکوں ۔ آپ لوگ تو نہ جانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں مجھے لگتا ہے کہ میں
بارود ہوں ۔ جو پھٹ جائے گا ۔ آپ نہ جانے ان کے اردگرد اتنے چاہنے والوں کا ہجوم
کیوں کر برداشت کر لیتے ہیں ۔ مجھ سے یہ سب نہیں سہا جاتا ۔ میں تو لوگوں کو ان کی
طرف تکتے دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی میرے کلیجے کو اپنی مٹھی میں لے کر مسل رہا
ہو ۔ یہاں تو میں ترّم دنیا نبھانے کو آ جاتا ہوں ۔ ورنہ میں تو اپنے علاوہ کسی کے "ان کو
دیکھنے تک کا روادار نہیں ۔ مجھے تو آپ بھی بُرے لگتے ہیں" ۔ اور یہ کہہ کر وہ مجھ سے دور
ہٹ گئے ۔ میں ان کی آنکھوں کی سرخی اور سوجن کا راز جان کر سناٹے میں رہ گیا ۔ مجھے
ان کے منہ اپنا پر الگتا سن کر خود پہ ناز سا ہوا ۔

میرے مراد کے گرد جمع ہونے والے لوگوں میں ان کے علاوہ ایک اور قسم
کے لوگ بھی آتے ہیں ۔ علم کی پیاس اور مرشد جیسا بننے کا لپکا ان کو دوسروں سے منفرد اور
ممتاز بنا دیتا ہے ۔ یہ ان کی باتوں میں ڈوب کر مفہوم کے موتی چنتے، ان کی توجہ سے اپنے
وجود کو سیراب کرتے اور مرشد کریم کی خوشنودی کے لئے کوشاں رہتے ہیں ۔ ان کی
صورتوں، عادتوں اور مزاجوں پہ ان کے مرشد کی گہری چھاپ نظر بھی آتی ہے اور محسوس
بھی ہوتی ہے ۔

مرشد نے ہر طرح کے لوگوں کو ان کی ذہنی سکت، افتادِ طبع، ذوق و شوق اور

ضرورت کے مطابق سیراب کرنا ہوتا ہے۔ان کی اپنی زندگی کے تمام تر معمولات میں
اولیت لوگوں کے لئے کرنے والے کاموں کی ہے۔ براہ راست علاج معالجے،
مشورے اور مسائل کے حل کے علاوہ ہر ماہ لاکھوں خطوط کا جواب لکھنا لکھانا ۔روحانی
ڈائجسٹ کے لئے مضامین لکھنا' رسالے کے امور کی نگرانی کرنا ۔اشاعتی ادارے کے
معاملات، دوا خانے میں ادویات کی تیاری کے مختلف مراحل پر جانچ اور پڑتال، مراقبہ
ہالوں کے امور پر براہ راست ہدایات دینا، یہ سب کام ملکی سطح پر نہیں بلکہ عالمی سطح پر کرنا
اور پھر ان سب کاموں سے بڑھ کر اپنی روحانی اولاد کی تربیت کرنا، ان میں پیغمبرانہ
طرز فکر منتقل کرنا ۔یہ سب کام کرنے کے لئے جتنی غیر معمولی اور ماورائی جہت، طاقت
اور توانائی چاہیے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ۔کہیں تربیتی سیمینار منعقد ہو رہے ہیں
تو کہیں ورکشاپس کا اہتمام ہے۔ کہیں بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد کر کے سلسلے کے
پیغام، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مشن کو پھیلایا جا رہا ہے۔ جب آپ کی توجہ اپنے
مرشد کے کئے گئے کاموں کے حوالے سے ان کی قامت پر جاتی ہے تو ایک طرف تو
آپ اس عظیم بندے سے تعلق پر نازاں ہوتے ہیں اور دوسری طرف ایک بہت ہی گہرا
احساس آپ کے اندر اپنی بے مائیگی اور کمزوری کا پیدا ہوتا ہے۔آپ خود کو ان کے سامنے
اتنا چھوٹا' اتنا کمتر اور اتنا عاجز محسوس کرتے ہیں کہ انہیں آپ پر پیار آ جاتا ہے۔وہ آپ

کو کسی بھی طرح یہ باور نہیں ہونے دیتے کہ وہ کتنے بڑے کتنے رفیع الشان ہیں ۔ وہ اپنے مقام سے محض آپ کی دلجوئی کو خاطر اتر کر آپ کے قریب آکر بیٹھ جاتے ہیں ۔ آپ سے بات کرتے ہیں ۔ سرگوشی کرتے ہیں اور بعض اوقات تو چھیڑ چھاڑ بھی ۔ ایک روز ارشاد فرمایا ۔ "یہ سلسلہ عالیہ عظیمیہ کا اعجاز ہے کہ ہمارے ہاں لوگوں کی طرز فکر بہت جلد بدل جاتی ہے ۔ طرز فکر میں تبدیلی سب سے زیادہ مشکل کام ہے ۔ اگر کسی کی طرز فکر میں چھ ماہ میں بھی تبدیلی نہیں آتی تو اسے چاہیے کہ وہ ہمیں چھوڑ دے ۔ ہمارے یہاں نسبت بہت قوی ہے ۔ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچنے میں درمیانی واسطے کم ہیں اور پھر اس سلسلہ پہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خصوصی عنایت ہے وہ اس سلسلے کے معاملات کی براہ راست نگرانی فرماتے ہیں ۔"

****

آبادی سے دور ملگجی سی چاندنی میں نہائے کھیت، رات کی مخصوص آوازیں، سناٹے کا حسن، آہستہ خرام قدموں کی سرسراہٹیں یہ سب ہمیں ایک ماورائی سے ماحول کا حصہ لگ رہا تھا۔ مرید نے چاند کی طرف دیکھا۔ دسویں یا گیارھویں کا چاند، لاہور سے دور گھروں سے اٹھتے دھوئیں کی تہہ میں جاتی سردیوں کی خنکی میں کچھ عجیب سا تاثر دے رہا تھا۔ بات چاند سے شروع ہو کر چاندنی پر آ کر سوال بن گئی ''جب سورج کی روشنی براہ راست زمین پر پڑتی ہے تو دھوپ کہلاتی ہے اور جب چاند سے منعکس ہو کر زمین تک پہنچتی ہے تو چاندنی کہلاتی ہے۔ اس انعکاس کے دوران اس روشنی میں ایسی کیا تبدیلی رونما ہوتی ہے کہ دھوپ کی حدت اور تمازت چاندنی کی ٹھنڈک اور نرماہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے؟''

میرا سوال سن کر ایک دو لمحے توقف کیا تاکہ ہم ان کے جواب کو سمیٹنے کے لئے اپنی سماعتوں کے کاسے پوری طرح پھیلا لیں اور فرمایا ''روحانی سائنسدانوں کا کہنا

ہے جیسے چاند خود روشن نہیں اسی طرح سورج بھی خود روشن نہیں ۔۔ روحانی آنکھ سے دیکھنے پر سورج ایک سیاہ ٹکیہ کی مانند نظر آتا ہے۔ درحقیقت زمین روشن ہے۔ سورج اس کی روشنی کو گرم کر کے پلٹاتا ہے۔ اسی کو ہم دھوپ کہتے ہیں۔ چاند میں سورج کے برعکس پارے کے تالاب اور جھیلیں ہیں۔ وہاں ابرق کے پہاڑ ہیں۔ جن کے باعث زمین کی روشنی ٹھنڈی ہو کر چاند کی سطح سے منعکس ہوتی ہے۔ پارے اور ابرق کی بہتات زمین کی روشنی کو ٹھنڈا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور یہ روشنی پھلوں اور اناج میں مٹھاس اور شیرینی پیدا کرتی ہے۔'' میرے مراد کے جواب نے نہ صرف ہماری فہم و فراست کے دروازے وا کر دیئے بلکہ آگہی کے سورج کی ضیا پاشیوں سے ہمارے قلب و نظر میں جگمگاہٹ اتر آئی۔ شعور ان باتوں کی ندرت سے تحیر میں گم ہو کر رہ گیا۔ اس نے ایک مزید سوال داغ دیا۔

''چاندنی اور پاگل پن میں جو گہرا تعلق ہے روحانی سائنس اس کی بابت کیا نظریہ رکھتی ہے؟'' چاندنی میں ٹھنڈک کا عنصر ایسی کیفیت ہے جس کے باعث ذہن پر سکون ہو جاتا ہے اور پر سکون ہونے سے لاشعور کی طرف رجحان بڑھ جاتا ہے۔ اس رجحان کا ابنارمل ہونا پاگل پن کہلاتا ہے۔'' جواب ملا۔

سوال کتنا ہی غیر اہم اور غیر منطقی کیوں نہ ہو میرے مراد کے نور فراست

سے جگمگا اٹھتا ہے۔ ان کی شفقت نے شہہ دی اور چاند اور چاندنی کے حوالے سے اس کے مدوجزر سے تعلق کی بابت پوچھے بنا رہ نہ سکا۔

فرمایا ”دراصل پانی میں پارے کا رنگ ہوتا ہے۔ اس لئے چاندنی میں اس کے لئے کشش ہوتی ہے۔ رنگ کو رنگ کھینچتا ہے اس لئے پانی ہلکا ہو کر اوپر اٹھ جاتا ہے اور مدوجزر رہتا ہے۔“

گھمبیر گتھیوں کو ایک ہی جملے میں سلجھا ہر کسی کو کہاں آتا ہے؟۔ میرے مراد کی یہ ایک بہت ہی خاص ادا ہے۔ کتنی ہی معمولی بات پوچھی جائے کتنا ہی ادنیٰ سا سوال کیوں نہ ہو کبھی ٹالیں گے نہیں۔ ٹالیں گے تو اس میں بھی کوئی رمز ہوتی ہے جو بہت بعد میں سمجھ آتی ہے۔

اشفاق احمد نے اپنے ایک سفرنامے میں ممتاز مفتی کی زبانی صاحب حال کی خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ”وہ ہر معمولی، بے معنی اور لایعنی کا صحیح ادراک رکھتا ہے۔ اصل بات اس کی سمجھ میں آ چکی ہوتی ہے کہ معمولی ادنیٰ، لاشے اور لامکاں ہی حقیقت ہے اور بے حقیقی ہی اصل اور امر واقعہ ہے۔“

ایک بار رہیں لاہور میں اشفاق احمد ہمارے مرشد سے ملنے آئے۔ ہمیں تجسس ہوا کہ آج ان سے گفتگو میں کیسا رنگ جمے گا۔ اشفاق احمد کی روانی گفتار آج کیا

سماں باندھے گی اور میر ے مراد کی عقدہ کشائیاں کس کس طرح ان کے ذہن کی آبیاری کریں گی لیکن گفتگو کو رسمی جملوں سے آگے نہ بڑھتے دیکھ کر حیرت ہوئی ۔ اشفاق احمد کی خاموشی تقلیداً ہی ہوگی ورنہ وہ گفتار کے ایسے غازی ہیں جو رنگ جمانے سے کم ہی چوکتے ہیں ۔ پھر اشفاق احمد کو مخاطب کر کے فرمایا '' آدمی 5 روپے خرچ کر کے اخبار خریدتا ہے ۔ صبح سویرے جھوٹ اور دہشت گردی کی تلاوت کرتا ہے تمام دن کی پریشانی خریدتا ہے ۔''

اشفاق احمد کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھے اور کہا '' میں نے بانو قدسیہ سے کئی بار کہا ہے کہ تم دو اخبار خریدتی ہو اور پھر تمام دن دہشت زدہ رہتی ہو تمہیں خوف زدہ رہنے کا اتنا ہی زیادہ شوق ہے تو مجھے چار آنے دے دیا کرو میں تمہیں اتنا ڈرا دیا کروں گا، تمہیں مزید ڈرنے کی طلب نہیں رہے گی ۔''

مراد نے تبصرہ کیا ۔'' آدمی خبر پڑھتا ہے کہ فلاں جگہ اتنے لوگ مر گئے ۔ اب وہ کچھ کر تو سکتا نہیں اپنی بے بسی کا احساس اس کی افسردگی کا سبب بن جاتا ہے ۔ پھر وہ خبر پڑھتا ہے فلاں جگہ بم پھٹا ۔ فلاں جگہ حادثے میں اتنے لوگ مر گئے ۔ فلاں جگہ زلزلہ آیا ۔ فلاں جگہ لڑائی ہوئی ۔ اس سے بھی ذہن دہشت کی لپیٹ میں آ جاتا ہے '' پھر کچھ دیر توقف کے بعد کہا '' دراصل لوگوں کو بھی تو دوسروں کو مرتا دیکھ کر لطف آتا ہے ۔''

اشفاق احمد ''جی ہاں'' کہہ کر خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ نماز کا وقت ہوا تو مرشد کریم کی اقتداء میں نماز پڑھی گئی۔ حضور کی تلاوت پہ میرا ذہن ہمیشہ مجھے لحن داؤدی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ مراقبہ اور نماز کے بعد وہیں صف پر بیٹھے بیٹھے اشفاق احمد سے مخاطب ہو کر فرمایا ''حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے مجھ سے ایک بار فرمایا تھا آپ کی نظر کبھی اپنی صلاحیتوں پر نہیں جانی چاہیے۔'' پھر قدرے توقف کے بعد کہا ''ہاں بھئی۔ بات ہے بھی درست۔ انسان کا اپنا ہے ہی کیا۔ صلاحیتیں بھی تو اسی کی دی ہوئی ہیں۔'' پوری تقریر کو ایک جملے میں سمو دینا اختصار کلام کہلاتا ہے اور یہ فن بہت ہی گہرے تفکر سے جنم لیتا ہے۔

اشفاق احمد کچھ دیر خاموش رہے پھر وہ سوال جو جانے کب سے ان کے اندر اچھل کود مچائے ہوئے تھا باہر آ گیا۔ ''حضور۔ اس تمام تر موجودہ سماجی اور معاشرتی بگاڑ کو درست کرنے کا کیا علاج ہوگا'' اس سے پیشتر کہ جواب آنا شروع ہوتا انہوں نے ہلکے سے اضافہ کر دیا ''میرا مطلب ہے تکوینی طور پر''۔

میرے مراد نے اس بار جملہ نہیں دو لفظی بات کہی ''طوفانِ نوح'' اب اس کہنے میں نہ جانے کیا اثر تھا۔ اشفاق احمد کے چہرے پر ایک تاثر لہرا کر گزر گیا۔ اشفاق احمد مزید جتنی بھی دیر بیٹھے خاموش بیٹھے۔ پھر جانے لگے تو مرشد کریم انہیں ان کی گاڑی

تک رخصت کرنے گئے۔ جب وہ رخصت ہو گئے میرے مراد نے اپنے مخصوص دھیمے سے لہجے میں تبصرہ کیا ''یہ بہت اچھے آدمی ہیں۔''

اس دن کے بعد جب بھی کبھی ٹی وی پہ اشفاق احمد صاحب کا کوئی ڈرامہ چلایا ان کی کوئی کتاب نظر سے گزری تو بے اختیار دل اس کی طرف کھنچا کہ یہ ایک اچھے آدمی کی تحریر ہے۔ اس جملے کو سننے کے بعد سے اشفاق احمد سے ایک ذاتی سا تعلق محسوس ہونے لگا۔

ایک روز بہت بعد میں اشفاق احمد نے میرے مراد کی کتاب ''مراقبہ'' کی تقریب رونمائی میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہہ کر اپنا احترام کروایا ''عظیمی صاحب کو خدا کی طرف سے راہنمائی اور دستگیری کا ایسا جز عطا ہوا ہے کہ وہ آپ کے اندر پیدا ہونے والی الجھنوں سے آپ کو آپ ہی کی بدولت نکال دیتے ہیں یعنی جوگر ہیں آپ نے اپنی ذات کی مشکلیں کسنے میں خود لگائی تھیں انہیں آپ ہی کے ہاتھوں کھلوا کر آپ کو ہلکا پھلکا بنا دیتے ہیں اور پھر آپ کو اپنے کئے پر شرمندہ ہونے کا موقع بھی فراہم نہیں کرتے۔''

اللہ والے کبھی کسی کو شرمندہ نہیں کرتے کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کرتے کبھی کسی کو ڈانٹتے نہیں، برا بھلا نہیں کہتے اور نہ جانے کتنے ہی ایسے کام وہ نہیں کرتے جنہیں ہم دنیا دار لوگ محض اس لئے کئے چلے جاتے ہیں کہ شریعت میں ان کے کرنے پہ کوئی

تعزیر نہیں۔ حالانکہ وہ منع ضرور کیے گئے ہیں۔ اب شریعت میں تو جھوٹ بولنے اور غیبت وحسد سے بھی منع کیا گیا ہے۔ طریقت میں وہ ذہن بنایا جاتا ہے جب منع کی جانے والی باتوں سے طبیعت ہی ہٹ جاتی ہے۔ کسی تعزیر کے خوف سے نہیں بلکہ محض اس لئے کہ آپ کے دوست خالقِ کائنات نے انہیں پسندیدہ قرار نہیں دیا ہوتا۔ یہ ہوتی ہے وہ طرزِ فکر جو بندے میں معمولی بے معنی اور لایعنی کا صحیح ادراک پیدا کر دیتی ہے اور یہی وہ طرزِ فکر ہے جس کے حصول کے لئے لوگ جوق در جوق میرے مراد کے حضور آتے ہیں اور فیضیاب ہوتے ہیں۔

****

اس بار جب میں پشاور سے جامعہ عظیمیہ مراقبہ ہال لاہور پہنچا تو میرا ایک بہت اچھا دوست عباس مرزا میرے ہمراہ تھا۔ عباس مرزا سے میرے تعلق کی شروعات کالج کے زمانے میں ہوئیں اور چوتھائی صدی پر پھیلے ہوئے ان لمحات میں جب ہم اکٹھے رہے، ہم دونوں نے بہت کچھ آپس میں شیئر کیا۔ وہ چونکہ خود بہت اچھا انسان ہے اس لئے وہ مجھے بھی ایسا ہی سمجھتا ہے اور میں اس کے حسنِ ظن کو درست کرنے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

ہم کمرے میں داخل ہوئے تو میرا مراد سامنے پڑے تخت پوش پر گاؤ تکیے

سے ٹیک لگائے سر پر رکھے اپنے داہنے ہاتھ کو بائیں سے تھامے کچھ کہہ رہے تھے۔ دروازہ کھلنے اور ہمارے مخل ہونے پر جز بز ہونے کی بجائے چہرے پر مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔ ادھ کھلی آنکھیں پوری کھل کر اپنی حالت پر واپس آ گئیں۔ یہ بات ہمارے لئے قریب آنے کا اجازت نامہ اور کمرے میں دروازے کی جانب پشت کئے بیٹھے ہوؤں کے لئے کمرے میں ہماری آمد کی اطلاع ثابت ہوئی۔ وہاں بیٹھے لوگوں نے گفتگو رکنے پر ہمیں دیکھنا شروع کیا۔

یہ میرا ابا رہا کا تجربہ ہے کہ جب بھی میں نے اپنے مراد کو کچھ عرصہ بعد دیکھا ہے۔ ان سے پہلی ملاقات کا سا لطف اور تاثر مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس وقت مجھے کچھ اور نظر نہیں آتا۔ کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا۔ کمرہ، کمرے میں بیٹھے لوگ، وہاں پڑی اشیاء سب ہی کچھ معدوم ہو گیا۔ میں جس دروازے سے گزر کر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ دروازہ، پیروں تلے آنے والی دری، میرے مراد کے سامنے پڑے چائے کے برتن غرضیکہ سبھی کچھ لپک کر میرے مراد کو اوٹ میں چلے جاتے ہیں۔ اب صرف مرشد کریم میرے سامنے ہیں یا شاید یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ اب اس ایک لمحے کے جاودانی حصے میں صرف میں اپنے مرشد کے حضور حاضر ہوں۔

وہ سر سے بازو ہٹاتے ہیں۔ تخت پر سیدھے ہوتے ہیں۔ پاؤں تخت سے

نیچے رکھتے ہیں۔فرش پر سیدھے کھڑے ہوتے ہیں اور بانہیں پھیلا دیتے ہیں۔ان پھیلی ہوئی بانہوں میں ممتا کا کرنٹ دوڑ رہا ہے۔اس کرنٹ سے جو مقناطیسی قوت پیدا ہو رہی ہے وہ کئی ماؤں کے پیار کی کشش پر بھاری ہے۔میں بےخود و بےاختیار ہو کر بےمحابہ ان کے سینے میں جا گھستا ہوں۔یہ بےاختیاری نہ ہو تو آدمی تو وہیں باہر ہی ٹھٹھر کر رہ جائے۔لوگ ان سے ہاتھ ملاتے ہیں تو بدن میں ایک سنسنی سی' ایک کیف دوڑ جانے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ان کے نرم نرم ہاتھوں کے گداز کا ذکر ہوتے میں نے کئی بار سنا ہے اور یہاں تو میں ان کے پیار کی مقناطیسی کشش سے ان کے سینے سے چپکا کھڑا تھا۔اس لمحے میرے احساس میں ایک سناٹا چھا گیا تھا۔مجھے کسی بات کا کوئی ہوش نہیں تھا۔اپنے قدموں پہ قائم رہنے کا بھی نہیں۔میرے پیچھے کھڑا میرا پیارا دوست، کمرے میں موجود میاں صاحب، اکرم شہابی صاحب اور دوسرے احباب سب احساس و ادراک کی سرحدوں سے کہیں بہت ہی دور جا چکے تھے۔مجھے اپنا سانس لینا، اپنا ہونا تک بھولا ہوا تھا۔میرا وجود وہاں تھا ہی کب وہاں تو میں رہا ہی نہ تھا۔صرف میرا مراہو تھا۔اس کے چھتنار سائے کا احساس تھا۔میں ان کے گھنیرے سائے میں مدغم ہو کر غائب ہو چکا تھا۔

ایک بار مرشد کریم نے ہمیں بتایا تھا کہ روحانی لوگوں سے گلے مل کر جو سکون ملتا ہے وہ کہیں اور مل ہی نہیں سکتا۔جو ایک بار اس لطف اور کیف سے آشنا ہو جاتا ہے پھر

وہ ساری زندگی اسی سکون، اسی لطف، اسی کیف وانبساط کی تلاش میں رہتا ہے۔ آپ چھوٹے بچے کو گلے لگائیں آپ کو باقاعدہ سکون آور لہریں اپنے اندر منتقل ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ ٹھہرے ہوئے لمحات اور ٹھہرے ہوئے اجسام کا نہیں ٹھہراؤ اور سکون کا تذکرہ ہے۔ اس کیف آور سکون اور ٹھہراؤ کا عملی تجربہ مجھے اس وقت ہوتا ہے جب میں خود ان کے گلے لگتا ہوں۔

اس گلے لگنے اور لگانے میں جو فرق ہے اس کی طرف میں پہلی بار اس وقت متوجہ ہوا تھا جب میرے مراد نے عرس کے موقع پر خانقاہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے باہر قدم نکالا تو عقیدت مندوں کے ہجوم کا ایک ریلا ان سے گلے ملنے، ان سے بغل گیر ہونے اور اپنے آپ کو ان سے تبرکاً مس کرنے کو اس بری طرح ٹوٹ پڑا تھا کہ حضور کے کچلے جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس ریلے کو قابو کر کے منتظمین نے جب لائن لگوا کر لوگوں کو ان سے گلے ملنے کا موقع دیا تو لوگ اس زور و شور سے عقیدت کا اظہار کرنے کو گلے ملنے اور گلے لگنے لگے کہ حضور ہانپ ہانپ گئے۔ اس وقت خالد نیاز نے تبصرہ کیا تھا "یہ گلے ملنا ہے یا گلے پڑنا۔"

میں نے اس وقت جذبات کے امڈتے طوفاں کو سہارا بنا کر گلے ملنے بلکہ گلے پڑنے سے اجتناب کا عہد کیا اور طے کیا کہ آئندہ کے لئے منتظر رہا کروں گا کہ کب

آپ شفقت فرماتے ہوئے مجھے خود اپنے گلے لگائیں گے۔ سینے سے لگائے ہوئے جب آپ نے مجھ سے خیرو عافیت کا پوچھا تو میں گویا واپس اس جہان رسوم و قیود میں اتار دیا گیا۔ گلے لگ کر ہٹتا ہوں تو خود میں ایک عجیب تبدیلی دیکھتا ہوں۔ میرے کندھے جھک جاتے ہیں۔ نگاہیں چہروں کی بجائے زمین پر پیروں کو دیکھنا شروع کر دیتی ہیں۔ طبیعت میں گداز اور مزاج میں گداختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہاتھ ناف کے سامنے آکر ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ جاتے ہیں۔ میں ہٹتا ہوں تو قدم بھاری ہو جاتے ہیں میں بوجھل قدموں سے پیچھے ہٹتا ہوں عباس مرزا آگے بڑھ کر گلے لگتا ہے۔ میرا مرادا اس کو "آپ کیسے ہیں پروفیسر صاحب" کہہ کر جہاں اپنی زبردست یاداشت کا اظہار کرتے ہیں وہاں اسے اپنائیت کا ایک احساس بھی عطا کرتے ہیں۔ طبیعت میں اتنی حلاوت اور آسودگی آچکی ہوتی ہے کہ میں ان کے عباس مرزا کو گلے لگانے پر خود میں احساس ممنونیت ابھرتے دیکھتا ہوں۔ اسی جذبہ ممنونیت سے سرشار ہم نیچے بچھی فرشی چاندنی پر بیٹھ جاتے ہیں۔

میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب میزبانی کے آداب سے خوب واقف اور ان کے اظہار کو بہت بے باک ہیں۔ وہ چائے بنا کر پیالیاں ہماری طرف بڑھاتے ہیں۔ حضور اپنے مرشد گرامی حضور قلندر بابا اولیاؒ کی رباعی

دنیائے طلسمات ہے ساری دنیا

کیا کہیئے کہ ہے کیا یہ ہماری دنیا

مٹی کا کھلونا ہے ہماری تخلیق

مٹی کا کھلونا ہے یہ ساری دنیا

سنا کر ہماری تواضع کرتے ہیں۔ جذبات کی اتھل پتھل میں میں آگہی کو ان کے روبرو حاضر کرنے میں ناکام ہی رہتا ہوں۔ شاید عباس مرزا کے شاعر ہونے کے حوالے سے یہ اس کی تواضع تھی اس میں ہمارا حصہ اتنا نہ تھا۔ گفتگو کا سرا وہیں سے جوڑا جاتا ہے جہاں پر ہماری آمد بلکہ مخل ہونے سے پیشتر بات ہو رہی تھی۔ آپ بتا رہے تھے۔ ''یہ بیماریاں وغیرہ انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ جانوروں کو دیکھیں یہ بیمار نہیں ہوتے۔ آپ نے کبھی کسی بکری کو بلڈ پریشر کی شکایت کرتے سنا ہے کبھی کسی جانور کو بواسیر ہوتے دیکھی ہو تو بتائیں۔ ان کا طرز زندگی ایسا ہوتا ہے کہ وہ بیمار نہیں ہوتے۔''

ان کی باتوں کو بے یقینی شکوک اور وسوسوں کی گود میں پل کر جواں ہونے والے مجھ ایسے کٹ حجتی کے لئے ہضم کرنا کبھی کبھی مشکل ہو جاتا ہے۔ میرے ذہن میں بکریوں کو زکام لگنے، مرغیوں کے رانی کھیت اور دست لگنے کا خیال روکنے پر بھی نہ رک سکا۔ میرا ذہن میرے مرشد کے لیے ایک کھلی کتاب ہی ہوگا تبھی تو انہوں نے اگلا ہی

جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ جانور اگر بیمار ہوتے ہیں تو وہی جانور جو انسانوں کے قریب رہتے ہیں ان کیساتھ رہتے بستے ہیں۔ اس پر شہابی صاحب نے بتانا شروع کیا کہ جانوروں کو وہی دوائیاں دی جاتی ہیں جو انسانوں کی بیماریوں کے علاج میں استعمال ہوتی ہیں۔ اس کے بعد پودوں کو لگنے والی بیماریوں کا تذکرہ شروع ہوگیا۔ آپ نے بتایا کہ رنگ وروشنی سے نہ صرف انسانوں اور جانوروں کا علاج کیا جا سکتا ہے بلکہ اس طریقہ علاج سے پودوں کو بھی صحت مند بنایا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کے لئے نباتیات کا علم پڑھنا ضروری ہے۔ پھر یہ بھی بتایا کہ پودوں کا تعویز سے علاج زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ تعویز سے جہاں انسان ٹھیک ہو جاتا ہے وہاں پودے کیوں ٹھیک نہیں ہوں گے۔ انسان بھی تو پودوں ہی کی طرح اگتا بڑھتا پھلتا اور پھولتا ہے۔ ''پھر اپنی مخصوص مسکراہٹ کی چھتری پھیلاتے ہوئے فرمایا۔ ''ہم آدم کے پھل پھول ہی تو ہیں۔'' ۔۔۔۔ اور میرا ذہن آدم کے پھل پھول کی ترکیب کی ندرت میں محو ہوتا چلا گیا۔

مجھے حال ہی میں بلیک ہول کے بارے میں ایک مضمون پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ میرے ذہن میں مضمون کی چیدہ چیدہ باتیں گونج رہی تھیں اور مجھے اشتیاق یہ ہو رہا تھا کہ میں اپنے مراد سے اس کے بارے میں کچھ سنوں۔ میں نے بالآخر بلیک ہول کے بارے میں ان سے کچھ جاننے کو سوال پوچھ ہی لیا۔

مرشد کریم اپنے روحانی فرزندوں کی تربیت کے لئے سالکوں کی ذہنی استعداد اور افتادِ طبع کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی ایسی بات کہہ دیتے ہیں جو ایک گہرے تفکر کو جنم دے۔ ان کے ذہن میں تلاش جستجو اور کھوج پیدا ہو۔ تجسس کو مہمیز لگے اور ذوق آگہی بیدار ہو۔ اس کا اصل پس منظر جس قدر میں سمجھ سکا ہوں یہی ہے کہ روحانی علوم کا تعلق طرزِ فکر سے ہوتا ہے اور طرزِ فکر سیکھنے سکھانے سے زیادہ منتقل ہونے والی چیز ہے۔ روحانی علوم سے متعلق طرزِ فکر کا ایک اعجاز یہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں ہر لحظہ ایک نئی آن اور ایک نئی شان کا اظہار ہوتا ہے۔

میرے مراد نے میرے سوال پہ معصومیت سے طرح دے کر کہا ''بھئی بلیک ہول کے بارے میں وہی بتا سکتا ہے جس نے بلیک ہول کا مشاہدہ کیا ہو۔'' اب میرا یقین کہ مرشد ہی مجھے اس کے بارے میں اصلیت سے آگاہ کر سکتے ہیں ان کی اس بات کو ماننے میں آڑے آ رہا تھا۔ مجھے مصر پا کر صرف اتنا فرمایا کہ قرآن میں ان کا تذکرہ موجود ہے اور اس پر تین آیات ہیں اور ان میں اندھیروں کا لفظ استعمال کر کے ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس مختصر سے جملے میں انہوں نے مجھ کو کیا کیا سمجھایا۔ میں اسی تگ و دو میں لگا ہوا ہوں۔ لیکن بادی النظر میں اصلیت ماننے کو انہوں نے نشانات منزل کی نشاندہی کے علاوہ پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کوئی نیا

Phenomenon نہیں جس پر آپ اتنا اچھل رہے ہیں۔ بہت عرصہ پیشتر صدیوں پہلے قرآن اس کی وضاحت کر چکا ہے اور وہ بھی ایک بار نہیں تین بار اور یہ کہ بلیک ہول کی خصوصیات اندھیروں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس طرح بات کو قرآن فہمی کی ترغیب بنا کر مجھے قرآن پڑھنے، سمجھ کر پڑھنے اور اس میں تلاش و جستجو کا سلیقہ تعلیم فرما دیا۔

اس تربیتی پروگرام کا ایک حصہ صبح کے مراقبے کے بعد کی تقریر ہوتی ہے۔
اس تقریر کے بنیادی مقاصد میں طرز فکر کی منتقلی، علوم کی فراہمی، ذہنوں کی آبیاری، تزکیہ نفس اور غور و فکر کی دعوت سبھی کچھ ہوتا ہے۔ بعد مراقبے کے بعد جب سرور اور کیف ذہنوں پہ تہہ بن کر حواس کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہوتے ہیں۔ مرشد کریم کی میٹھی او دھیمی آواز ہمیں مطلع کر رہی تھی کہ انسان میں معین مقداریں کام کرتی ہیں۔ انسان اور اس کے علاوہ ہر شے کی تخلیق انہی معین مقداروں کے سبب ممکن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آم کے درخت پر صرف آم، سیب کے درخت پر صرف سیب ہی لگتے ہیں اور یہ سب کچھ ایک نپے تلے بندھے عظیم الشان سسٹم کے تحت ہو رہا ہے۔ اس سسٹم کی تفصیلات اور جزئیات کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ انسان میں تین باتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر اس کو دوسری مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔ معین مقداروں کا علم رکھنا۔ ان معین مقداروں میں کمی بیشی کر کے انہیں استعمال کرنے کی صلاحیت رکھنا اور

پھر ان کو ایک سسٹم کے تحت استعمال بھی کرنا یعنی مقداروں کا علم۔ اچھائی برائی کا علم اور سسٹم کو چلانے کا علم۔

پھر ایک ایک جزو کی تفصیل ارشاد فرمائی اور یہ وضاحت کی کہ سسٹم کو چلانے کے لئے درکار علم میں لہروں کی منتقلی کے قانون اور علم سے واقفیت ہونا بہت ضروری ہے۔ اس واقفیت کے حصول کا طریقہ روحانیت میں تصور شیخ ہے کیونکہ جب ہم شیخ کا تصور کرتے ہیں تو درحقیقت ہم شیخ کے اندر کام کرنے والی معین مقداروں کو لہروں کے ذریعے اپنے اندر منتقل کر رہے ہوتے ہیں۔

ایک روز فرمایا کہ مرشد کا کام یہ ہوتا ہے کہ مرید کو نہلاتا دھلاتا اور صاف کرتا رہتا ہے وہ جاتا ہے اور پھر سے گندہ ہو کر آ جاتا ہے۔ نہ یہ باز آتا ہے نہ وہ۔ دونوں اپنے اپنے کام سے لگے رہتے ہیں۔ یہ بات سن کر میرے ذہن میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ارشاد خداوندی تازہ ہو گیا۔

''اور بے شک وہ تو آپ کا تزکیہ کرتے، کتاب کا علم عطا کرتے اور حکمت سے آراستہ کرتے ہیں۔

(قرآن)

مرشد کریم اتباع سنت میں ہی تو وہ مشکل اور کٹھن کام کر رہا ہوتا ہے جس کو

قرآن نبی کی ڈیوٹی قرار دے رہا ہے۔

رات کو ماڈل ٹاؤن میں روحانی لائبریری دیکھنے گئے۔ یہ لائبریری شاہین صاحب نے اپنے گھر میں ایک کمرہ مخصوص کر کے بنائی ہے۔ پورے ملک کے طول و عرض میں لائبریریوں کا ایک جال بچھا دیا گیا ہے۔ لوگوں میں مطالعے اور کتب بینی کے ذوق کو پیدا کرنے، اسے ابھارنے، سلسلہ کے پیغام کے پھیلانے کے لئے ہر شہر میں کئی کئی لائبریریاں قائم کی گئی ہیں۔ ہر جگہ یہ لائبریریاں اپنی مدد آپ کے اصول پر خدمت خلق کے جذبے سے شہر کے مراقبہ ہال سے راہنمائی لے کر قائم کی جاتی ہیں۔ لائبریریوں میں زیادہ تر کتب روحانی موضوعات پر ہوتی ہیں اس لئے بھی ان لائبریریوں کو روحانی لائبریریاں کہا جاتا ہے۔ یہ لائبریری بہت ہی نفاست اور عمدگی سے بنائی گئی تھی۔

شاہین صاحب بتا رہے تھے کہ الماریوں وغیرہ پر اتنے ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں اس پر مرشد کریم نے اپنے مخصوص لہجے میں تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا "جی ہاں پیسہ بول رہا ہے۔"

لائبریری دکھانے کے بعد شاہین صاحب نے میاں صاحب کی فرمائش پر اپنی ورکشاپ اور لیبارٹری دکھائی وہاں وہ ویڈیو فلمیں بناتے ہیں۔ اسی دوران وقار

یوسف عظیمی بھی وہاں پر پہنچ جاتے ہیں اور رات کا کھانا سب مل کر کھاتے ہیں۔ کھانے کے دوران بھائی جان (وقار یوسف صاحب) صبح ڈسٹرکٹ بار روم میں ہونے والے حضور کے خطاب کی بات چھیڑ دیتے ہیں۔ حضور سب کو دعوت فکر دیتے ہوئے پوچھتے ہیں "مجھے کل وہاں کیا کہنا چاہئے۔" سب حسب توفیق مشورے دینے لگے۔

میں نے سوچا میرے مراد نے ایسا کیوں کہا۔ ہم اس قابل کہاں اور کیسے ہو گئے کہ انہیں مشورہ دے سکیں جو اس وقت تک ایک انتہائی محتاط اندازے کے مطابق اٹھارہ بیس لاکھ افراد کو مشوروں سے نواز چکے تھے۔ انہیں ہم ایسوں سے مشاورت کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ شاید یہ سب بھی ہماری تربیت کا حصہ تھا۔

حقیقی عظمت کے اجزائے ترکیبی میں انکسار جزو اعظم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا اظہار روحانی لوگ اس لئے کرتے ہیں کہ دوسروں کے لئے مثال ہو اور ان کے اتباع کو کسی صفت کی عملی صورت کا مشاہدہ ہو سکے۔

شاہین صاحب کے گھر سے مراقبہ ہال کی طرف جاتے ہوئے گاڑی میں میاں صاحب نے کوئی بات دریافت کی۔ اس پر فرمایا "ایک بار میں نے حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے دریافت کیا کہ حضور اللہ میاں کو کون سا عمل سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ فرمایا! میرا خیال تھا کہ حضور قتل یا اسی قسم کے کسی دوسرے عمل کو ناپسندیدہ بتائیں گے مگر اس

وقت مجھے بہت حیرت ہوئی جب حضور نے فرمایا ''طلاق'' ۔یعنی طلاق دینا یا طلاق لینا اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ سب سے زیادہ پسندیدہ عمل؟ فرمایا میرا خیال تھا کہ حضور عاجزی یا اسی قسم کے کسی اور عمل کا کہیں گے مگر انہوں نے فرمایا۔ ''خدمتِ خلق۔''

میں نے دونوں باتوں پہ غور کیا تو محسوس ہوا کہ دونوں کا تعلق انسانوں کے آپس کے تعلقات سے ہے۔ آپ تعلق ختم کریں یہ بات ناپسندیدہ اور آپ تعلق بڑھائیں یہ بات پسندیدہ۔ ابھی ہم یہی کچھ سوچ رہے تھے کہ آپ نے فرمایا ''ذوقی شاہ نے جو یہ کہا ہے کہ کامل مرشد وہ ہوتا ہے جو مرید کو ہر مقام سے گزار تو دے مگر دیکھنے کچھ نہ دے۔ اس کا کیا مطلب؟ میاں صاحب سے پوچھا پھر مجھے کہا ''آپ بتائیں''۔ میں نے اس اعزاز پر کہ مجھ سے مرشد نے براہ راست کلام کیا ہے پھولتے ہاتھوں کو آپس میں دبا کر عرض کی ''ہم اس وقت اس سڑک پر گزر رہے ہیں۔ باہر جو عمارات ہیں وہ ہمیں دکھائی بھی دے رہی ہیں مگر ہم انہیں دیکھ نہیں رہے کیوں کہ ہماری توجہ ان کی طرف نہیں آپ کی طرف ہے۔ ہم اس مقام سے آپ کے ہمراہ گزر تو رہے ہیں مگر اسے دیکھ نہیں رہے۔ شاید یہی مفہوم ہو یا اس کے علاوہ۔'' فرمایا دراصل مرشد کے ہمراہ آپ ایک مقام سے گزر یں اور پھر بعد میں جب آپ وہاں خود جائیں گے تو آپ کے شعور پر بوجھ نہیں

بنے گا۔ ایک بچہ ہے وہ اپنے باپ کے ساتھ لندن جاتا ہے۔ پھر جب وہ جوان ہو کر لندن جائے گا تو لندن اس کے لئے نیا نہیں ہوگا اس کے ذہن میں یہی بات ہوگی کہ میں یہاں پہلے بھی آ چکا ہوں۔"

اب حقیقت یہ ہے کہ ذوقی شاہ صاحب کے جملے کا بظاہر مطلب یہی تھا کہ مرید کو مرشد کہیں رکنے نہ دے کہیں اٹکنے نہ دے مگر اس کے اندر کے مفہوم کو کس طرح مراد نے اپنے مریدوں پر واضح کیا یہ اس کے انداز تربیت کا اعجاز ہی تو کہلائے گا۔

رات گئے جب ہم مراقبہ ہال کے دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوئے تو مراقبہ ہال کے کھلے لان میں بچھی چاندنی نے ہمیں اپنی گرفت میں لے لیا اور ہم اپنے مراد کو گھیرے میں لے کر دیر تک بیٹھے ان سے باتیں کرتے رہے۔ انبیاء کے علوم کی باتیں۔ انبیاء کی تعداد کے بارے میں۔ قرآن میں مذکور انبیاء کے تذکرے۔ ان تذکروں میں مذکور حکمتیں۔ سب ہی کچھ۔ کسی کو شاید ہی معلوم ہو رہا ہو کہ علم کس طرح اس کے اندر انڈیلا جا رہا ہے۔ علم کے دھارے کا رخ ہمارے قلوب کی طرف تھا اور یہ سب غیر محسوس تھا۔ وہاں سے ہٹنے کے بعد ہی معلوم ہوتا تھا کہ ہم نے کیا کچھ اخذ کیا، کیا کچھ سیکھا اور کیا کچھ ساتھ لے کر آئے اور کیا کچھ وہیں گرا آئے۔

****

اگلے روز صبح جب مرشد کریم کے ہمراہ لاہور ڈسٹرکٹ کورٹس کے لئے روانہ ہوئے تو آبلو روڈ سے کوٹ لکھپت تک ہر شے جو آنکھوں کے آگے سے گزری گزرتی ہی چلی گئی۔ کوٹ لکھپت سے گزرنے کے بعد لاہور کی پرشور ٹریفک نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ لاہور کے خدوخال نظر آنا شروع ہوئے۔ میں گاڑی میں مرشد کریم کے بالکل پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اتنا بڑا اضطراب تک کہاں تھا۔ میں جامعہ عظیمیہ جاتے ہوئے آج سے تین چار روز پہلے بھی تو یہیں سے گزرا تھا۔ مجھے یہ بات کیوں بھول رہی کہ میں لاہور آیا ہوا ہوں۔ دل نے سرگوشی میں جواب دیا۔ قرب مراد کا اب اتنا اثر تو ہونا ہی چاہئے تھا۔

مجھے اب تک لاہور میں گزرے وقت گزرے دن یہاں گزرا ماضی، یہاں جن جن تجربوں سے دوچار رہا، یہاں رہنے والے عزیز و اقارب اور دوست رشتے دار

کیوں یاد نہ آئے؟ میں نے اپنے دل سے اصرار کیا۔ لاہور میں گزاری مال روڈ کی شامیں۔ نہر کے کنارے موٹر سائیکل پر میلوں فراٹے کی سواری۔ گرمیوں میں نہر میں نہانا۔ شاہی قلعے اور بادشاہی مسجد کے سامنے بارہ دری میں گزاری راتیں، طالب علمی کے دن، عملی زندگی کی کاوشوں کے اولین دور کی کھٹی میٹھی یادیں سبھی کچھ تو حافظے سے اترا ہوا تھا۔ آخر کیوں؟ یہی سمجھ میں آیا کہ ذہن کی سطح پر کوئی لہر چلتی ہے تو خیال اور تصور جنم لیتے ہیں۔ جب لہریں ہولے ہولے دبے پاؤں چلتی ہیں تو خیال و تصور بھی مدہم مدہم اور دھندلے دھندلے سے ہی جنم لیں گے۔ یادوں کی لہریں احترام مراد میں اتنی آہستہ خرام اور سبک رو تھیں کہ مجھے راستے تک یاد نہیں آ رہے تھے۔ میں نے چوہدری جی کو دیکھا اور صرف دیکھا کیا، اس کے سامنے گزرے لمحات میں سے کسی لمحے نے آواز نہ دی۔ اب مجھے اس پر کوئی حیرت نہ تھی۔ صرف اتنا تاثر ابھرا کہ یہ سڑک جو اب چوہدری جی کے گرد اگرد گھوم کر گزر رہی ہے پہلے یہاں نہ تھی۔ حیرت کے حافظے میں جاگزیں ہونے سے پہلے ہی ہم وہاں سے آگے بڑھ چکے تھے۔

ٹریفک کے بے ہنگم شور میں ہم لوئر مال سے گزر رہے تھے کہ اچانک پورا لاہور شہر زندہ دلاں مجھے بہت عجیب سا لگا۔ بدلا بدلا سا۔ مال کی طرف سے ٹریفک کا ایک دھارا لوئر مال کے بہاؤ میں شامل ہو رہا تھا۔ اس سنگم پر لوہے میں مقید سواریوں کو

ایک دوسرے کو کچل دینے اور خود کو بچا لینے کی آرزوں سے لڑتا دیکھ کر میں نے اپنے مراد کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھے تھے۔ پیچھے سے دیکھنے پر ان کے چہرے پر تبھی نظر پڑتی تھی جب وہ دائیں یا بائیں دیکھتے۔ انہوں نے دائیں طرف دیکھا چہرے کا جتنا حصہ نظر آیا وہاں صرف سکون کی حکمرانی تھی۔ ان کی نظر مقام بدلتی ہے تب بھی نہ پتلی میں جنبش ہوتی ہے اور نہ آنکھ حرکت کرتی ہے۔ آدھ کھلی آنکھیں، نچلا ہونٹ ساکت رہنے کے باوجود اک مسکان کو نمایاں کر رہا ہوتا ہے۔ دانت نہ ہونے کے باوجود پوپلا پن چہرے پر نظر نہیں آتا۔ جب بھی کبھی کہیں خطاب کرنے جاتا ہو۔ کسی اجتماع میں تقریر کرنا ہو تو صاف ستھرے لباس پہ ٹوپی اور عینک کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور خوشبو۔۔۔ خوشبو وہ کب نہیں لگاتے۔ میں جب بھی ان کے قریب ہوا میں نے مشام جاں کو معطر ہوتے پایا۔ سو اس وقت بھی قراقلی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ چشمے میں فوٹو سیل شیشے لگے ہوئے تھے جو روشنی کی شدت کے ساتھ تاریک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ٹوپی کے نیچے گردن کے پاس نظر آنے والے بالوں کو مہندی سے رنگا دیکھا۔ بال مہندی رنگ کے بجائے سنہری سے نظر آ رہے تھے۔ کچھ عجیب سا حسن بکھرا دیکھ کر میرا جی چاہا کہ میں کہوں کہ آپ نے مہندی لگا کر بہت اچھا کیا مگر جب بولا۔ تو منہ سے نکلا۔ آپ پر مہندی بہت جچ رہی ہے۔ مرشد کریم نے اس اطلاع کو شفقت بھرے لہجے میں ''اچھا''

کہہ کر قبول کیا اور پھر بتایا کہ کس طرح ان کی بیٹی نے ان کے لئے مہندی بنائی اور انہوں نے کچھ ان کی خاطر اور کچھ گرمی کے لئے مفید جان کر لگائی۔ میں نے سوچا کہ میں نے کہنے میں جملہ کیوں بدلا۔ میرے اندر اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کبھی کبھی بہت طویل بحث ہوتی ہے۔ ابھی یہ بحث ابتدائی مراحل میں ہی تھی کہ ہم ضلع کچہری کی عمارت میں گاڑی سے اتر رہے تھے۔

میں ضلع کچہری کی عمارت بہت عرصے کے بعد دیکھ رہا تھا۔ ہم گاڑی سے اترے تو دھوپ میں تمازت تھی۔ بڑھتی ہوئی آلودگی ہی اس کا سبب رہی ہوگی۔ لوگوں کے چہرے صبح کی تازگی اور بشاشت کی بجائے کھنچے، تنے اور ستے ہوئے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار ہمیں بتایا گیا تھا کہ آلودگی سے پیدا ہونے والے جراثیم اتنے زہرناک ہوتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک آدھ بھی انسان کے نچلے ہونٹ کی اندرونی سطح پر لگ جائے تو آدمی پانی بن کر بہہ جائے مگر یہ قدرت کا ایک عجیب راز ہے کہ انسانی سانس سے وہ لاکھوں کی تعداد میں مر جاتے ہیں اور منہ کے قریب نہیں آتے۔ یعنی انسانی سانس ان جراثیموں کے لئے سم قاتل ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ دور دور ہی رہتے ہیں۔ یہ جراثیم اتنے باریک اور اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ کسی خردبین سے نہیں دیکھے جا سکتے۔ لوگ تازہ دم نہیں تو کچھ عجب نہیں۔ آلودگی سے سب کچھ ممکن ہے۔ دھوپ سے بچنے کو ہم عمارت کے

سائے میں آکر کھڑے ہوگئے ۔ میں نے اردگرد دیکھا ۔ ہر کوئی اپنے دھیان میں مگن، اپنی سوچوں میں غلطاں آ جا رہا تھا ۔ یہ عمارت بھی نہ جانے کتنے ہی لوگوں کو روزانہ الجھنوں، پریشانیوں اور گھٹن میں لڑتے دیکھ دیکھ کر تھک چکی تھی ۔ مجھے یہ عمارت بیزار بیزار سی لگی ۔ عمارت کے سائے میں اسی بات پر بات شروع ہوگئی ۔

مختلف عمارات مختلف کیفیات سے کس طرح متاثر ہو کر انہی کیفیات کی آئینہ دار بن جاتی ہیں اور وہی کیفیات ان کے قریب جانے والوں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں ۔ عدالتوں، کچہریوں میں رعب پژمردگی، اندیشے اور وسوسے، تھانوں میں کرب، احساس جرم اور دہشت زدگی، ہسپتالوں میں بیماریوں کا اداس تاثر اور تکلیف، بینکوں میں ایک مخصوص چمک، حرص اور کاروبیت، ہوٹلوں میں مسافرت کے جھنجھٹ، طعام و قیام اور خانقاہوں میں سکون اور عقیدت کے ساتھ طلب اور امید کی کیفیات کچھ اس طرح رچ بس جاتی ہیں کہ بعض اوقات تو عمارات کو دور سے ہی دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ عمارت سکول ہے یا دفتر ۔ گھر ہے تو کیسا ۔ گھروں کی عمارات اپنے مکینوں کے تصورات کا عکس ہوتی ہیں ۔ یہیں سے ایک گھر کی کیفیات کے دوسرے سے جدا اور منفرد ہونے کی بات بھی سمجھ میں آ گئی ۔

بار روم میں خطاب کے دوران ایک بات وہاں کے سب شرکا محسوس کر

رہے تھے کہ آج کی تقریر کا موضوع اور گفتگو کا دھیما دھیما انداز ان کے لئے اگر الوکھا نہیں تو نیا پن ضرور رکھتا ہے۔میرے مراد نے آغاز تقریر میں بار کونسل کے صدر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں موجود لوگوں کے روحانیت کے موضوع سے دلچسپی کو سراہا اور انسان کے آگے بڑھنے کی خواہش، حیوانات سے ممتاز ہونے کی کاوش۔پتھر کے زمانے سے آج تک کے ارتقا کی بات سنا کر بتایا کہ یہ دنیا سترہ بار تباہ کر کے دوبارہ آباد کی گئی ہے اور اب پھر اس کا ارتقا اپنے اختتامی مراحل پر پہنچ چکا ہے۔لیکن اس سفر میں انسان ایک بار پھر پریشانیاں اور بے سکونی سمیٹ لایا ہے۔جب ہمارے پاس وسائل کم تھے، سکون زیادہ تھا۔جب وسائل زیادہ ہو گئے ہیں تو سکون کم ہو گیا ہے۔مادی وسائل چونکہ عارضی ہوتے ہیں اس لئے ان سے حاصل ہونے والا سکون بھی ناپائیدار اور عارضی ہوتا ہے۔مادیت میں ہر چیز پر ہر لحظہ فنا وارد ہوتی ہے لیکن مادیت کو سنبھالنے والی چیز پر موت وارد نہیں ہوتی انسان جو کچھ کرتا ہے کہیں سے آنے والے خیالات کو موصول کر کے کرتا۔اس لئے اس کو کسی بات کا کوئی اختیار بھی حاصل نہیں۔تمام سائنسی ایجادات کسی نہ کسی خیال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔لیکن ہم خیالات کے علم سے واقف نہیں اس لئے اس نظام کو سمجھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں۔انسان اس لیے پریشان نہیں کہ وہ مادی وسائل استعمال کرتا ہے بلکہ اس کی پریشانی کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے ان وسائل کو مقصد حیات بنالیا ہے۔

اگر ہم دنیا کو ایک مسافر خانہ، ایک ہوٹل یا ایک بحری جہاز کی طرح وقت آنے پر چھوڑنے کے لئے تیار رہیں اور مقصد وسائل کو نہیں بلکہ وسائل بنانے والے کو بنالیں تو ہمیں پریشانیاں اپنا نشانہ نہیں بناسکیں گی۔

پیر سے مراد نے زور دے کر فرمایا کہ وسائل بچے کے پیدا ہونے سے پہلے موجود ہوتے ہیں یعنی یہ دنیا ہمارے لئے بنائی گئی ہے ہمیں دنیا کے لئے نہیں بنایا گیا۔ ہمیں اس دنیا میں مسافروں کی طرح زندگی گزارنی چاہیے اور اس کے لئے ہمیں پیغمبروں کی زندگی کو مثال بنانا ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے سلسلہ عظیمیہ کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ یہ روحانی علوم کو سائنسی بنیادوں پر سیکھنے اور سکھانے کے لئے طریقت کا ایک اہم سلسلہ ہے۔ ہمارا مشن یہ ہے کہ انسان سکون آشنا ہوکر زندگی بسر کرے۔ انسان کو سکون تبھی حاصل ہوسکتا ہے جب کہ وہ اپنی اصل سے واقف ہو اور انسان کی اصل اس کی روح ہے۔

انہوں نے کہا کہ تصوف یہ نہیں کہ انسان کپڑے نہ پہنے یا پہنے تو پھٹے پرانے پہنے اور جنگلوں میں جا بسیرا کرے۔ ہم اس مادی ترقی سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے بھی تصوف کے راہنما اصولوں سے فیض یاب ہوسکتے ہیں اس کا طریقہ مراقبہ کرنا ہے اور

پھرانہوں نے مراقبہ کرنے کا طریقہ بیان کرکے تقریر ختم کردی اور اپنی کتب کا ایک سیٹ وکلاء کی لائبریری کے لئے تحفتاً دیا۔

بار کونسل کی رسم یہ ہے کہ وہاں خطاب کرنے والوں سے سوال جواب نہیں کئے جاتے لیکن ایک رکن نے کہا کہ یہ خطاب چونکہ سیاسی خطاب نہیں بلکہ علمی گفتگو ہے لہذا اس کی وضاحت کے لئے سوال کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس پر بار کے صدر نے میرے مراد سے درخواست کی کہ اگر وہ پسند فرمائیں تو چند ایک سوالات کے جواب دے کر لوگوں کو مزید مستفیض ہونے کا موقع دیں۔ خواجہ صاحب نے آزاد کشمیر جانا تھا اور خطاب میں پہلے ہی کافی وقت لے چکے تھے لیکن پھر بھی آپ نے دو یا ر وہ تک سنبھال لیا۔

اس پر سوال کیا گیا کہ مراقبہ کیوں؟ نماز کیوں نہیں؟ جواب میں آپ نے فرمایا کہ جب ہم کوئی کام کریں تو اس کام کے لئے ضروری ہے کہ ہماری توجہ بھی اس کام میں ہو اس کے لئے آپ نے Concentration کا انگریزی لفظ استعمال کیا اور کہا کہ جب تک آپ کی تمام صلاحیتیں ایک مرکز پر مرکوز نہ ہوں گی آپ کوئی کام ٹھیک طرح سے نہیں کر سکتے۔ آپ اگر منتشر خیال ہوں تو آپ صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے۔ مقدمے کی مناسب تیاری نہیں کر سکتے۔ اگر کسی کو نماز میں یکسوئی اور Concentration

حاصل ہے تو یہ نماز بھی اس کے لئے مراقبہ ہے۔ مراقبہ دراصل Concentration ہی کی مشق کا نام ہے۔

پھر ایک سوال تصوف کی ایک اصطلاح جمع الجمع کے حوالے سے کیا گیا۔ اس پر خواجہ صاحب نے تبسم فرماتے ہوئے کہا کہ آپ اس محفل میں ایسے سوال پہ بات کی دعوت دے رہے ہیں کہ اگر میں اس کی تشریح کروں تو صرف میں سمجھوں گا یا آپ۔ یہاں بیٹھے ہوئے باقی حضرات کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔ کبھی آپ میرے پاس آئیں تو اس پر گفتگو ہو۔ کچھ آپ کہیں کچھ میں کہوں۔ اس کے بعد بالکل ہی سادہ سے الفاظ میں یہ کہہ کر بات کی وضاحت کرتے ہوئے موضوع کو لپیٹ دیا کہ تصوف آپ کو یہ بتاتا ہے کہ کس طرح قدم قدم چل کر عرفان حاصل ہوتا ہے۔ مومن کو مرتبہ احسان حاصل ہوتا ہے۔ یعنی وہ اللہ کو دیکھتا ہے اس سے ملتا ہے اور پھر یہ کہہ کر بات ختم کر دی اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے بندے کو قربت دے سکتا ہے۔

سوالات کے بعد بار روم سے ملحق کمیٹی روم میں چائے کا اہتمام تھا۔ چائے پر بھی گفتگو کا موضوع روحانیت ہی رہا۔ ایک صاحب نے بہت ہی چبھتا ہوا سوال کیا۔ ’’آپ مراقبہ میں تصور شیخ کرتے ہیں یہ تو بت پرستی ہی کی ایک قسم ہو گئی۔‘‘ اس پہ آپ نے تصور شیخ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ’’تصور شیخ کا اگر یہ مطلب لیا جائے کہ شیخ

کی تصویر ذہن میں اجاگر ہو تو یہ بت پرستی ہوئی اور اگر دھیان شیخ کر طرف لگا دیا جائے تو اس کے ذہن سے رابطہ قائم ہونے پر اس کے اندر کام کرنے والی لہریں سالک میں منتقل ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔''

ایک اور صاحب نے یوگا اور مراقبہ میں فرق کی بابت دریافت کیا۔ اس پر آپ نے فرمایا ''جی ہاں ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ یوگا پانچ ہزار سال پرانا علم ہے۔ انہوں نے اس کو پرانے انبیاء سے لیا پھر اس میں تحریف ہو گئی جیسی کہ بائبل میں ہوئی چونکہ قرآن میں نہیں ہوئی اس لئے عبارت بچ گئی۔ آپ ترجمے اور تفاسیر دیکھیں جس کا جتنا بس چلا ہے اس نے اپنا مطلب ڈال دیا ہے آپ پانچ چھ مختلف تفاسیر پڑھ لیں آپ الجھ جائیں گے۔ اسی طرح یوگا میں بھی تحریف ہو گئی یوگا میں اب محض اپنی طاقتیں بڑھانے اور ان کا مظاہرہ کرنے پر زور دیا جاتا ہے جب کہ مراقبہ در حقیقت اللہ تک پہنچنے اور اس کا عرفان حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔''

اتنے جامع الفاظ اور اتنے بھرپور انداز اتنے مدلل جواب سن کر وکلا حضرات نے اپنے دلوں میں جو بھی محسوس کیا ہو مجھے کچھ یوں لگا جیسے ان کی نگاہوں میں میرے مراد کے لئے ایک گہری ستائش اتر آئی ہو اور اس کا اظہار بھی جلد ہی ہو گیا جب کئی وکلاء نے آپ کے آج کے لیکچر کی تعریف کی اور ان کی کتب پہ اظہار خیال کیا۔ ان کے لہجوں

میں اب عقیدت کی آمیزش ہو چکی تھی۔

بار روم کی بلڈنگ سے باہر نکلتے ہی مجھے یکدم وہاں وکلا اور سائل نظر آنا شروع ہو گئے۔ خطاب اور چائے کے دوران میری توجہ نہ جانے کیوں ان کا احاطہ نہیں کر رہی تھی۔ میں نے پاس سے گزرتے انسانوں کے ہجوم میں ڈھلتی دوپہر کی تھکن اور پژمردگی محسوس کی اور سوچا کہ اگر یہ لوگ جان لیں کہ آج ان کے درمیان سے گزرنے والا مہمان ان کے لئے کیا کیا تحفے لے کر آیا تھا تو کیا وہ ان کی اس آسانی اور سہولت سے یہاں سے گزر جانے دیتے اور اگر ان کو اس کا ادراک ہو جاتا تو بھلا اس وقت کیسا عالم ہوتا۔ ایک چھینا جھپٹی ایک ہاہا کار مچی ہوتی۔

ایک بوری سکون مجھے چاہیے۔

مسرتوں کا ایک بنڈل مجھے دینا۔۔۔

یہ ذہنی سکون کا توڑا مجھے درکار ہے۔

یہ سکون قلبی کا بورا مجھے دے دو میں مر رہا ہوں۔

نجات کرب کا ایک ٹین دینا بھئی۔

دافع شکوک کا ایک کنستر میرے لئے کافی نہیں مجھے تو دو چاہئیں۔

مجھے عرق دائمی کیف چاہئے۔

چند پڑیاں شادمانی اور دیتا ۔وسوسوں کا مرہم ۔ اندیشوں اور پریشانیوں کے تریاق اور خوشیوں کے امرت دھارے کی شیشیاں کم پڑ رہی ہوتیں۔

لیکن اس وقت یہاں ایسا کوئی سین نہ تھا۔ ہمارے اردگرد سب اپنی اپنی پریشانیوں اور جمع تفریقوں میں اتنے منہمک تھے کہ ان کو نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی فرصت نہ تھی ۔ نظر اٹھتی بھی تھی تو بصارتوں پر مہریں لگے پردے ہونے کے سبب جو نظر آتا تھا ۔ وہ وہ نہ تھا جو دراصل ہوتا ہے اور جو ہوتا ہو اور وہ نظر نہ آئے ، دکھائی ہی نہ دے تو بندہ جاہل ہو کر علم ہی نہیں ظالم بھی کہلاتا ہے۔

جنہیں کچھ دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا وہ اس تگ و دو میں تھے کہ اس سود ے کو حاصل کرنے کا طریقہ پوچھیں ۔ کچھ ہچکچا کر پیچھے رہ گئے کچھ نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا ۔جس نے پوچھا اسے لاہور مراقبہ ہال سے رابطہ کرنے کا کہتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے ۔

مرشد کریم نے اکرام شہابی صاحب کے گھر جاتے ہوئے راستے میں بتایا کہ کراچی میں **عظیمیہ** کلب بنایا گیا ہے اور اس کی سرگرمیوں کا بنیادی مقصد یہ بتایا کہ اس طرح بھائیوں کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے کے مواقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں معاشرتی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مواقع مل سکیں ۔ انہیں معاشرہ میں

رہنے کا سلیقہ بھی آنا چاہئے۔ ہوٹلوں میں کلب کے حوالے سے میٹنگ وغیرہ کریں۔ ایک تو یہ سستا پڑتا ہے دوسرے ان کے ذہن کھلیں گے۔ ان کو دنیاداری کے آداب بھی سیکھنے چاہئیں۔ پھر فرمایا کہ ان کے ذہنوں سے امارت کا خوف تبھی نکلے گا جب یہ اسے قریب سے دیکھ لیں گے۔ اسے برتنا سیکھیں گے۔ پھر کئی واقعات سنائے کہ کس طرح ہم لوگ بڑی عمارات میں جانے سے ہچکچا جاتے ہیں۔ اس کے رعب میں آ جاتے ہیں۔

مرشد کریم میرے اچھے خیالات کو کس طرح سنوارنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ میرے نصیب ہیں۔ مجھے کئی بار یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمیں جتائے بغیر کسی اور کو بات سناتے ہوئے کوئی اور تذکرہ کرتے کرتے ہمارے اندر کے جالے ہٹا رہے ہوں۔ غلط نظریات کے جالے غلط تصورات کے جالے۔ غلط سوچوں کے جالے یہ جالے ہی تو بصارت اور بصیرت دونوں کو دھندلا کر رکھ دیتے ہیں۔ بصیرتوں کو جلا دینے کے لئے ان جالوں سے نجات پانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا بصیرتوں کی نشوونما کے لئے ان کی آبیاری کے لئے انہیں غیر جانبدارانہ طرز فکر سے سیراب کرنا لازم آتا ہے۔ علوم و آگہی کی فراہمی میں کبھی کبھی یہ جالے سدراہ ہو جاتے ہیں اور اچھی بھلی بات سمجھ آ کر بھی سمجھ نہیں آتی۔ شیطان کو پر مارنے کا موقع مل جاتا ہے۔

آج صبح ہی مراقبہ ہال میں یہ منظر گزرتے دیکھا تھا۔ ناشتے سے پیشتر کچھ طلبا

آئے وہ ذہنوں میں مختلف سوالات اور الجھنیں لے کر آئے تھے اور داد رسی چاہتے تھے۔ کئی ایک سوالات کے بعد ان میں سے ایک صاحب نے سن 2006ء کی پیشین گوئی کے حوالے سے پوچھا کہ کیا کوئی ایسا طریقہ ہو سکتا کہ اس ہونے والی بات کو روکا جا سکے اور جب جواب میں یہ سنا کہ جب ایک بات اللہ تعالیٰ کے ہاں طے ہو جائے تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا تو پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ بیٹھے تو جب سب کچھ تباہ ہی ہو جانا ہے تو پھر ہمیں کچھ کرنے کی کیا پڑی ہے۔ خواجہ صاحب کی بصیرت سے ان کے ذہنوں کے جالے اور کجی کہاں چھپی رہ سکتی تھی۔ ان کا علاج کرنا ضروری تھا۔ ایک بات ان کے ذہنوں میں نہایت غلط انداز میں بیٹھ جانے کو تھی۔ اس سے ان کی پریشانیوں میں اضافہ ہو جاتا اور یہی بات فقیر کسی قیمت پر برداشت نہیں کرتے۔ میرے مراد نے ایک ہی جملے میں سب صاف کر کے رکھ دیا۔ آپ نے فرمایا۔ ''دراصل شیطان نے ان کے کان پر پھونک ماردیا ہے۔ تاکہ ان کا ذہن جمود کا شکار ہو جائے۔'' اور پھر بڑی شفقت سے سمجھایا ''مرنا تو یوں بھی سب نے ہے۔ اکٹھے مریں یا باری باری۔ مر تو سب ہی رہے ہیں لیکن آپ موت کے خوف سے حرکت سے باز آ جائیں گے تو آپ تو وقت سے پہلے ہی مر جائیں گے۔ موت میں بھی تو حرکت ہی بند ہوتی ہے۔ انسان کی اس دنیا کی حرکت۔ انسان فنا تو نہیں ہو جاتا مرنے سے۔ آپ اپنا کام کریں۔ ابھی بہت وقت پڑا ہے 2006ء

آنے میں۔ ''میرے ذہن میں اسی وقت اس حدیث مبارک کے الفاظ تازہ ہو گئے۔ اگر کسی کے ہاتھ میں کھجور کی ایک قلم ہو اور قیامت آ جائے تو اسے چاہئے کہ وہ اسے زمین میں لگا دے۔''

شہابی صاحب کے گھر کچھ دیر قیام کے بعد ہم میاں صاحب کے گھر گئے وہاں کھانا کھا رہے تھے کہ حاجی اور یس صاحب مرشد کریم کو کاکڑہ ٹاؤن لے جانے آ گئے۔ کھانے کے بعد میاں صاحب سے رخصت ہو کر ہم عازم کشمیر ہو رہے تھے تو میں نے بچیوں کو عقیدت کے آنسوؤں کی لڑیاں پروتے دیکھ کر سوچا کہ اتنے عظیم مہمان کے گھر سے رخصت ہونے پر بعد میں جس طرح گھر کھانے کو دوڑے گا کیا یہ اس کے خوف سے نکلنے والے آنسو ہیں۔ میرے جی میں آیا نہیں یہ آنسو شکر کے ہیں جو عطا دیکھ کر اپنی کم مائیگی پر کئی بار خود میری آنکھیں اور دامن دھو چکے ہیں۔

****

لاہور سے نکلتے ہوئے جب ہم داتا صاحبؒ کے مزار کے قریب سے گزر رہے تھے تو میرے ذہن میں مرشد کریم کے کہے ہوئے الفاظ تازہ ہو گئے۔ انہوں نے ایک بار حضرت داتا صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ ''ایک زندگی یہ بھی تو ہے۔ یہاں کب سے لنگر بٹ رہا ہے۔'' آپ بادشاہوں کے مقبرے دیکھیں اور اس کا موازنہ فقیروں کے مزاروں سے کریں۔ ایک تمام تر جاہ و حشمت کے باوجود ویران اور بے رونق۔ دوسرے کسی جاہ و حشمت کے سہارے کے بغیر بھی آباد اور پر رونق۔ ایک طرف درسِ عبرت اور دوسری طرف تعلیم حکمت۔ ایک عمارت فنا کی دوسری زندگی کی دھڑکن

کی۔

ایک بار فرمایا تھا ''کبھی کسی بادشاہ کو توفیق نہیں ہوئی کہ وہ لنگر چلائے یہ فقیروں کا ہی اعجاز ہے۔ وہ زندگی میں تو مخلوق خدا کی خدمت میں کوشاں رہتے ہی ہیں ان کے وصال کے بعد یہ سلسلہ رکنے کے بجائے اور بھی دراز ہو جاتا ہے۔''

اب حضور داتا صاحبؒ کا مزار ایک کمپلیکس بن رہا ہے۔ مزار کا احاطہ وقت کے گزرنے کا ساتھ ساتھ پھیل کر اب باہر کی سڑک تک آن پہنچا ہے۔ اس میں مسجد کے علاوہ ایک ہسپتال بنے گا۔ فقیر کے در سے کس کس طرح فیض بٹتا ہے۔ یہ بھی اسی فیضان کی ایک صورت ہے۔

ایک بار ہم کراچی سے آئے ہوئے بھائیوں اور اپنے مراد کے ہمراہ داتا صاحب آئے تھے کسی نے مزار پر حاضری کے آداب کی بابت پوچھا۔ آپ نے فرمایا۔ ''جائیں جا کر سلام کریں جیسے کسی بڑے سے ملتے ہیں ادب سے بیٹھیں۔ توجہ اپنے مرشد کی طرف رکھیں۔'' مزار پہ چہل پہل میں بھی سکون اور خوشی کا تاثر نمایاں تھا۔ کچھ دیر بیٹھے پھر باہر آئے تو مرشد کریم نے ایک دیگ والے سے بات کی۔ غفار بھائی نے آگے بڑھ کر دیگ لی۔ اس پہ جھپٹ مارا یکدم لوگ قطار میں کھڑے ہو گئے۔ رومال، لفافے، پلاسٹک کے تھیلے ایک آدھ جھولی پھیلی اور دیگ ختم۔ پھر سب نے باری باری

ایک ایک دیگ خریدی اور غفار بھائی بانٹتے رہے۔ کھڑے کھڑے پندرہ سولہ دیگیں بٹ گئیں۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ دوپہر یا رات کے کھانے کا ہوتا تو ہجوم کی جانے کیا کیفیت ہوتی۔ آپ نے لنگر کے اس انداز پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

کراچی میں عرس کے موقع پر لنگر میں کھانا باقاعدہ چُن دیا جاتا ہے اور زائرین دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ پھر ہزاروں برتنوں کی صفائی، دیکھ بھال اور انتظامات۔ پھر اگر کوئی رہ گیا تو ساری محنت اکارت۔ فرمایا ''یہ خوب ہے نہ کھلانے کا انتظام نہ برتن سنبھالنے کا جھنجھٹ۔ لوگ آئے۔ لنگر میں حصہ بھی لیا۔ لنگر کھایا بھی اور بانٹا بھی۔''

اب ہم راوی کے پل سے گزر رہے تھے۔ دریا کو پایاب دیکھا تو میرا دل دھڑکا۔ اپریل کی اختتامی تاریخیں اور دریا اتنا پایاب۔ ''بارشیں نہ ہونے کا اثر ہے۔'' حاجی ادریس صاحب نے تبصرہ کیا۔ تو کیا اس بار برفیں نہیں پگھلیں گی۔ وسوسے نے سر ابھارا۔ کہیں دریاؤں کی پایابی کا کوئی تعلق ہمارے اعمال سے تو نہیں جا جڑتا۔ باہر بادہ دری بھی خاموش نظر آئی وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سب ہی اپنے اپنے دھیان میں تھے۔ باہر والے بھی اور گاڑی کے اندر والے بھی۔ میں نے توجہ کو گاڑی کے اندر کھینچ لیا۔ میری نظریں اپنے مراد کے مہندی لگے سنہری بالوں پر آ کر رک گئیں۔ قراقلی ٹوپی

کی جگہ اس وقت سفید ٹوپی نے بالوں کے سنہرے پن کو کچھ اور بھی ابھار دیا تھا۔ سنہرے پن سے مجھے Aura کے رنگوں کی بات یاد آئی کہ اگر Aura میں سنہرا رنگ ہو اور نظر آئے تو اس کا مطلب ہے کہ صاحب اور انتظامی صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔۔ شائد اسی لئے سنہرے رنگ کو ہی شاہی رنگ گردانا جاتا ہے۔

گوجرانوالہ تک سب خاموش ہی رہے۔ ممتاز علی، حاجی ادریس اور راقم پیچھے بیٹھے ڈرائیور کو گاڑی چلاتے دیکھتے رہے حاجی ادریس کے ذہن میں کاکڑ ٹاؤن کے انتظامات گزر رہے ہوں گے۔ وہ یہ کرنا ہے وہ کرنا ہوگا۔ یہ نہیں کرنا کے چکر میں ہوں گے۔

گوجرانوالہ میں ہم سید طاہر جلیل کے گھر رکے۔ طاہر بھائی مرشد کریم کو گھر کے اندر لے گئے اور ان کے چھوٹے بھائی ناصر ہمیں لے کر بیٹھک میں بیٹھ گئے۔ چائے پی گئی۔ ناصر کی طبیعت میں بہت جلد گھل مل جانے کی عادت ہے انہوں نے چائے کے دوران خوش گپیوں اور شگفتہ جملوں سے تو اضع جاری رکھی۔ چند جملے ہم نے ممتاز علی کی طرف بھی لڑھکائے جو انہوں نے مسکرا کر جانے دیئے۔ وہ کم ہی کسی جملے بازی میں حصہ لیتے ہیں۔ مرشد کریم نے فون پر کراچی بات کی۔ گھر والوں کی خیریت دریافت کی وہاں کے امور پر ہدایات دیں۔ مشن ہی کے کاموں کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ وہ ایک مثالی والد، ایک مثالی سربراہ اور ایک مثالی رشتہ دار بھی ہوں۔ رشتہ داریوں میں

عموماً تو ذہن رکھنا محال ہو جاتا ہے میں نے انہیں اپنے رشتہ داروں، عزیز و اقربا سے جس قدر مفاہمت آمیز برتاؤ کرتے دیکھا وہ انہی کا حصہ ہے۔ مرشد کریم کی چھوٹی بیٹی کی شادی پر حضور کے بڑے بھائی جناب اویس احمد انصاری صاحب آئے تو آپ انہیں ساتھ لے کر کھانا چیک کروانے لے گئے۔ وہاں جب آپ نے اپنے ہاتھوں سے فیرنی کا چمچ ان کے منہ کی طرف بڑھایا اور انہوں نے منہ کھول کر فیرنی کھائی۔ اس وقت مجھے فضاؤں میں ہر طرف پیار ہی پیار برستا محسوس ہوا تھا۔ عمر کے اس حصے میں بھائیوں میں اتنا پیار۔۔۔ میں نے یہ منظر پہلی بار دیکھا تھا۔ اس وقت وہ دونوں بزرگ مجھے دو چھوٹے چھوٹے معصوم سے بچے لگ رہے تھے۔ اتنی معصومیت۔ اتنا پیار۔ میری پلکیں نہ جانے کیوں بھیگ سی جاتی ہیں ایسے مناظر دیکھ کر۔

گوجرانوالہ سے نکلے تو جی ٹی روڈ پر سفر جاری ہوا۔ اب ہماری منزل جہلم تھی خاموشی سے سفر ہو رہا تھا۔ خاموشی کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ جب زبان کو قابو کر لیا جائے تو آنکھیں اور دیگر اعضا مصروف گفتگو ہو جاتے ہیں۔ اگر نہیں بھی چپ کر لیا جائے تو بات چیت بندے کے اندر شروع ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی بات چیت کا زیادہ لطف سفر میں ہی آتا ہے۔ آدمی باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتا ہے اور گزرتے مناظر کی دیکھتے دیکھتے اپنے اندر خود سے باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ مجھے ان باتوں میں

زیادہ لطف اس لئے بھی آتا ہے کہ کوئی میری زبان نہیں پکڑتا۔ گرامر یا اخلاق کی غلطی پر ٹوکتا نہیں۔ ٹوکتا ہے تو کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ یہ گفتگو کبھی کبھی بڑی علمی ہی ہو جاتی ہے اور جب ایسا ہو جائے تو بڑے بڑے نکتے کھلتے ہیں اور اسرار سمجھ میں آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

میرے مرشد کو یقیناً ان سب باتوں کا مجھ سے کہیں زیادہ ادراک اور تفہیم حاصل ہے لہٰذا وہ سفر کے دوران عموماً خاموش ہی رہتے ہیں۔ جب کبھی اس خاموش گفتگو میں کوئی ایسا مقام آ جائے جو الفاظ میں ڈھل کر آواز بن جائے اور ہم ان سے کوئی بات پوچھ لیں تو جواب میں ہماری سوچوں کی ساری الجھنیں نکال کر انہیں کنگھی کر کے سنوار دینا ان کو بہت خوب آتا ہے۔ بات کا جواب پا کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے میرے ذہن کو استری کر دیا ہو۔ اس کی ساری شکنیں تمام سلوٹیں غائب ہو جاتی ہیں۔

جب گوجرانوالہ سے نکلے تو سورج غروب ہونے کو تھا۔ سڑک کنارے کسی مدرسے کے بورڈ پر نظر پڑی اپنے درس و تدریس کے حوالے سے یادوں کا ایک سلسلہ آغاز ہو کر دراز ہوتا چلا گیا۔ اور بات

مکتبِ عشق کا دستور نرالا دیکھا

اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

پر آ کر ٹھہر گئی۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جس
نے سبق یاد کر لیا اس کو ہی چھٹی نہ ملے۔ میرے اندر کے میں نے جواباً کہا۔ ہاں ہے تو۔
اس پر ہم دونوں میں بات شروع ہو گئی۔ بہت باتیں ہوئیں۔ میں نے بھی بہت سر لڑایا۔
اس نے بھی بہت زور مارا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس قسم کی دھاندلی ہے کہ جو شاگرد
سبق یاد کر لے اسی کو چھٹی نہ ملے۔ یعنی یہ سبق یاد نہ کرنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ لیکن
جب توجہ مکتب عشق کے دستور پر جاتی تو اور الجھن ہوتی کہ عشق سے باز کرنا تو بہر حال
مقصود و مدعا نہ ہوگا۔ بالآخر اگلی نشست پر بیٹھے استاذ سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بجائے
بات کا جواب دینے الٹا مجھ ہی سے پوچھ لیا۔ ''آپ کہاں تک سمجھے؟'' میں چونکا تو کیا
آپ میرے اندر کی گفتگو دوسروں کو بھی سنوانا چاہتے ہیں۔ بہر حال عرض کی ''عشق میں
علم کی نفی کر دینا لازم ہے لہٰذا جو سبق یاد ہو گیا وہ علم بننے کے سبب مکتب عشق کے دستور
کے مطابق اب نفی کا پابند ہو گیا۔ اب جو کچھ پڑھا اس کی نفی ہو جائے تو بندہ کورے کا کورا
رہ گیا اور اسے پھر سے پڑھنا لازم آ گیا۔''

میں آپ کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ آپ نے رخ بدل کر
چہرہ ہماری جانب کیا اور فرمایا ''اس شعر میں مکتب عشق سے مراد خانقاہی نظام ہے جب
مرید کو مراد کا ذہن اور طرز فکر حاصل ہو جاتا ہے تو گویا سبق یاد ہو گیا۔ یہاں دستور سے

مراد طرزِ فکر ہے۔اب وہ کسی اور کام کا کہاں رہا۔وہ تو اپنے مرشد کے کام سے لگ گیا۔ وہ ایک بھنور میں داخل ہو گیا جس سے نہ وہ خود باہر نکلنا چاہتا ہے اور نہ نکل سکتا ہے۔آپ ایک تالاب میں کنکر پھینکیں لہریں پھیلیں گی تو آخر کہاں تک۔اسی تالاب کے اندر رہی ان کا جینا اور مرنا ہے۔وہیں فنا ہو جائیں گی، جیسے تالاب میں اٹھنے والی لہر کناروں سے ٹکرا کر واپس تالاب میں پلٹ جاتی ہے اسی طرح مرید کی ہر سوچ ہر فعل اور ہر عمل ایک لہر کی طرح اپنے تالاب کے کناروں سے ٹکرا کر واپس پلٹتی رہتی ہے۔"

میرے اندر کے متصوف کو ایک لولی پوپ مل گیا وہ اسے چوسنے لگا اور اسی میں مگن رہتا چلا گیا۔گاڑی چلے جا رہی تھی۔خیالات کی رفتار جو گاڑی کی رفتار سے ہم آہنگ ہوا کرتی ہے آج معدوم تھی۔میں ایک ہی خیال کا جھولا جھولنے میں لگا ہوا تھا۔ جس کو سبق یاد ہو گیا اس کو چھٹی کر کے کیا کرنا ہے۔

ایک بار بچپن میں میرا بازو ٹوٹ گیا۔ہسپتال میں پلستر چڑھانے سے پیشتر سفید لباس میں سفید ٹوپی پہنے مشن ہسپتال کی نرس نے ماسک میرے منہ پر رکھتے ہوئے مجھے تسلی دی اور گنتی سنانے کو کہا۔گنتی آٹھ کے بعد بارہ پندرہ سولہ اٹھارہ ہوئی تو مجھے یوں لگا جیسے گھومنے والے جھولے پر چک پھیریاں لے رہا ہوں۔جھولا تیز سے تیز تر ہوتا چلا جا رہا تھا وہاں جھولے سے نیچے ایک بچہ کھڑا تیز سیٹی جیسی آواز نکال رہا تھا جب میں گھومتا

ہوا اس کے پاس سے گزرتا تو وہ آواز تیز ہو جاتی اور میرے دور ہٹنے کے ساتھ ساتھ وہ آواز مدہم ہو جاتی ۔ پھر تیز ہوتی اور پھر مدھم ہوتی ۔ یہ آواز سنتے سنتے میں جب ہوش میں آیا تو میرا ٹوٹا ہوا بازو جڑ چکا تھا اور اس پر پلستر ہو چکا تھا ۔ بالکل کچھ ایسی ہی کیفیت میں میں یہ آواز سنتے سنتے ، جس کو سبق یاد ہو گیا ۔ اس کو گنتی کر کے کیا کرتا ، جب ہوش میں آیا تو گاڑی ایک چھوٹی سی مسجد کے پاس مغرب کی نماز کے لئے رکی ہوئی تھی ۔ میرے مراد حاجی ادریس اور ممتاز علی صاحب کے ہمراہ تنگ راستے والی مسجد میں داخل ہو رہے تھے ۔

میں مسجد کے طرف لپکا ۔ جب میں مسجد میں پہنچا تو دیکھا کہ آپ موزے اتار رہے ہیں ۔ سفید رنگ کے تو لئے کے بروالے موزوں سے جیسے باہر آئے تو اس ملگجے سے اندھیرے میں بھی مجھے اپنے مراد کے پاؤں گورے گورے سے لگے ۔ انہوں نے وضو کیا ۔ ہم وضو کرنے بیٹھے تو انہوں نے نماز آغاز کر دی ۔ ہم تینوں نے بھی نماز ادا کی ۔ دوران نماز مجھے احساس ہوا کہ مسجد میں برقی رو نہیں ہے اور ایک لالٹین کی روشنی اجالا کئے ہوئے یا اندھیروں کو دور رکھے ہوئے ہے ۔ اندھیروں کو دور رکھنا اتنا مشکل بھی نہیں شرط صرف دیا جلانے کی ہے ۔ میں نے اپنے آگے کھڑے لائٹ ہاؤس کو دیکھا اور سوچا ۔

لوڈ شیڈنگ نے کینڈل لائٹ نماز ادا کروا دی ۔ عقب میں پڑی لالٹین کے

باعث ہمارے سامنے ہمارے سائے ہمارے رکوع و سجود کے سبب گھٹ بڑھ رہے تھے۔ میں اپنے گھٹتے بڑھتے سایوں کو دیکھ رہا تھا۔ شام کے جھٹپٹے میں مسجد کے اندر ایک عجیب سا ماحول در آیا۔ پراسرار سا۔ پراسراریت کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ شاہ عبدالعزیزؒ کی مسجد میں جن کا ایک بچہ اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے ہاتھ لمبا کر کے چراغ گل کر دیتا ہے۔ کیا میرا سایہ لمبا ہو کر میرے مراد کے سائے میں جذب ہو سکتا ہے۔ خیال میں آیا اس کے لئے ضروری ہے کہ تم مرشد کے پیچھے ایسی جگہ کھڑے ہو جاؤ جہاں سے تمہارا سایہ ان کے سایے سے جا ملے۔ شرط صرف پیچھے کھڑے ہونے کی ہے اور یہ بات سمجھنے کے بعد عمل کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔

نماز سے فارغ ہو کر مراد نے جنات ہی کی بات بتانا شروع کر دیا۔ فرمایا ''حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے عالم جنات میں بھی سلسلہ عالیہ عظیمیہ جاری فرمایا ہے۔ وہاں پر شہنشاہ عفریت خانوادہ سلسلہ ہیں۔ اسی لئے جنات اور آسیب سلسلے کے لوگوں سے دور ہی رہتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ شکایت ہو جائے گی۔''

''پھر تو شہنشاہ عفریت آپ کے پیر بھائی ہوئے'' ممتاز علی نے خوشی کے لہجے میں کہا ''جی ہاں۔ ایک بار جنات کے دو گروہوں میں ٹھن گئی۔ شہنشاہ عفریت نے مجھ سے کہا۔ خواجہ صاحب اگر آپ آ کر ہمارے ساتھ کھڑے ہو جائیں تو دوسرے گروہ

کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔خیر وہ مجھے وہاں لے گئے۔مجھے وہاں دیکھ کر تو سچ مچ ان میں بھگدڑ مچ گئی" "آپ نے کوئی منتر پڑھا ہوگا" ممتاز علی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی نہیں۔سیدھی سی بات ہے اگر آپ کسی جن کو دیکھ لیں تو ظاہر ہے آپ گھبرا جائیں گے۔اسی طرح جنات نے جب ایک آدم زاد کو اپنے مخالف گروہ کی مدد پر آمادہ پایا تو وہ بھی گھبرا گئے۔جیسے آپ جنات سے ڈرتے ہیں اسی طرح ان کی اکثریت آدمیوں سے خائف ہے۔"

مسجد سے نکلتے ہوئے جب آپ جوتی پہن رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ سلیم شاہی تلے کے کام والا جوتا ہے۔کاڑی سک میں ان جوتیوں کو دیکھتا رہا۔میرے مراد کے پیروں میں وہ ایک عجیب چھب دکھا رہی تھیں۔

جہلم مراقبہ ہال پہنچے تو وہاں کے نگران راجہ منیر صاحب کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پھولوں کے ہار لئے استقبال کو منتظر پایا۔ہمیں مراقبہ ہال کے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ہم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دراز ہوکر یا نیم دراز ہوکر اپنی تھکن کو بہلا دیا تھا۔مگر باہر صحن میں مرشد کریم اسی طرح ہشاش بشاش، تازہ دم نظر آتے لوگوں میں گھرے انہیں اپنی چھتنار مسکراہٹ کے سائے میں لئے بیٹھے تھے۔وہی میٹھی مدھر مدھم

سروں والی آواز وہی پرسکون ٹھہرا ہوا لہجہ اور وہی آدھ کھلی نیم خوابیدہ آنکھیں۔ الٰہی کیا یہ تھکتے نہیں۔ میری سوچ کے جواب میں میرے مرادی کا فرمایا ہوا ایک جملہ میرے ذہن میں گونجا۔ جو انہوں نے سلسلے میں داخلے کے بعد میرے اولین دنوں میں کہا تھا۔ میں نے سلسلے کے پھیلاؤ، خدمتِ خلق کے حجم اور ان کو روز و شبانہ محنت کا اندازہ لگا کر ایک بار پوچھا تھا ''آپ اتنا کام کیسے کر لیتے ہیں۔'' اس پر آپ نے فرمایا تھا ''مقصود صاحب! مشن کے کام دیوانگی کے بغیر ممکن نہیں۔ فرزانے کبھی مشن وشن کے چکروں میں نہیں پڑا کرتے۔''

اس لمحے تک میرے ذہن میں دیوانگی کی جو بھی تصویر رہی تھی وہ وہاں سے اتر گئی اور اس کی جگہ ہشاش بشاش رہ کر سلیقے اور نفاست سے کام کو محض اس لئے کرتے رہنا کہ کام ہو جائے، صلے کی تمنا اور ستائش کی پروا کئے بغیر کام کئے چلے جانے والے ایک بندے کی تصویر بج گئی۔

رات کا کھانا کھا کر راجہ منیر صاحب سے رخصت ہو کر ہم جہلم سے روانہ ہوئے تو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے آپ نے حاجی ادریس صاحب سے کہا ''کہیں چائے پینی چاہئے۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ حاجی صاحب ڈرائیور کو ہدایت دے کر گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے باہر سڑک پر چائے کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ دینہ سے پہلے سڑک کے

کنارے ایک ہوٹل میں چائے پینے کے دوران آپ نے تھکن اور سر درد کا اظہار کیا۔ شاید میرے نظر لگ گئی تھی۔

حضور بتا رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے راولپنڈی میں بھی مراقبہ ہال کے لئے زمین کا بندوبست کر دیا ہے۔ کاکڑہ والوں کے بعد پنڈی جائیں گے تو وہاں زمین دیکھ کر اس کی بات طے کرنا ہے۔ اس کے بعد شاید میرا دل بڑھانے کو ارشاد فرمایا ''سوچتا ہوں کہ مجھے ایک دو روز کے لئے پشاور بھی ہو آنا چاہئے۔ اب جب اتنا آ ہی گیا ہوں تو تھوڑا سا اور آگے جانے میں کیا ہرج ہے۔ پنڈی سے نہ اترے پشاور سے اتر گئے۔'' میں خوشی اور سرشاری سے جھوم ہی تو اٹھا۔ ممتاز علی نے میرا ہاتھ دبایا۔ جیسے مبارک دے رہے ہوں۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ میں نے پشاور نہیں دیکھا ہوا اس بار یہ بھی ہو جائے گا۔ میں نے سوچا کہ انہوں نے پشاور نہیں دیکھا اور میں نے کشمیر۔ مرشد کریم ہم دونوں کو ہی انجانی راہوں سے آشنا کروانے کو ان دیکھی بستیوں کا مشاہدہ کروانے لے جا رہے ہیں۔

دینہ سے منگلا کی طرف مڑے تو میں رات کے اندھیرے میں اس خطے کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاں میں پہلی بار جا رہا تھا اور مجھے خیال آ رہا تھا کہ روحانی علوم میں ہر تشنگی کو مٹانا ضروری ہوتا ہوگا۔ ہر آرزو ہر تمنا یا تو پوری کر دی جاتی ہے اور یا پھر ذہن

میں سے اس کی طلب ہی اکھاڑ پھینک دی جاتی ہے تا کہ ذہن میں کوئی خلش کوئی ارمان اور کوئی تشنگی نہ رہے ۔ بندہ اتنا پُرنظر ہو جائے کہ کوئی منظر کوئی بات اس کی راہ کھوٹی نہ کر سکے ۔ کشمیر دیکھنے کا مجھے کئی بار خیال آیا تھا مگر عدیم الفرصتی کے علاوہ اور بھی کئی وجوہات آڑے آتی رہی تھیں اور آج میرے بھاگ ایسے جاگ رہے تھے کہ میں اپنے مراد ہادی اپنے مرشد کے ہمراہ وادی کشمیر جنت نظیر کی طرف جا رہا تھا ۔

منگلا چھاؤنی سے گزرتے ہوئے ہوا خنک اور خوشگوار محسوس ہوئی ۔ پھر رہ رہ کر خوشبو کے جھونکے آنا شروع ہوئے ۔ مجھے ایسے لگا کہ ان فضاؤں نے آگے بڑھ کر میرے مراد کے قدم لئے ہوں ۔ حاجی ادریس صاحب جو اب تک غیر محسوس سے میزبان بنے ہوئے تھے یکدم ایک مستعد اور فرض شناس گائیڈ بن گئے ۔ یہ منگلا کی چھاؤنی ہے ۔ وہ سامنے جو روشنیاں نظر آ رہی ہیں منگلا پاور ہاؤس کی ہیں ۔ منگلا کی جھیل خشک ہو چکی ہے ۔ بارشیں نہیں ہوئیں نا ۔ پچھلے سال ڈیم میں اتنا پانی بھر گیا تھا، حاجی ادریس صاحب بتا رہے تھے اور باہر کھیت کی ہوئی چاندنی منظر کو چار چاند لگا رہی تھی ۔

جب ہم میرپور میں داخل ہوئے تو رات ڈھل رہی تھی ۔ پستہ قامت عمارات اور بازار میں بنکوں کی بہت سی شاخیں دیکھ کر میں نے سوال آمیز تبصرہ کیا ’’یہاں بنک کچھ زیادہ نہیں ؟ ۔‘‘ ممتاز علی جو بینکار رہیں ۔ بتانے لگے کہ بدیس گئے لوگوں

کی رقومات کے سبب یہاں بنکوں کا کاروبار بہت زیادہ ہے۔تمام برانچیں فارن Remittances کے سبب پھل پھول رہی ہیں یہاں ایڈوانسز تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔لوگ اس سرمائے کو صرف بنکوں میں رکھ کر ہی خوش ہوتے ہیں۔لوگوں کی خوشی کے تذکرے کے ساتھ ہی چوک میں لگے بینر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا جو جناب خواجہ شمس الدین عظیمی خانوادہ سلسلہ عالیہ عظیمیہ اور مشہور روحانی سکالر کی کشمیر آمد کی نوید اور ان کے وہاں پر قیام کے اطلاع لے کر ہوا میں لہرا رہا تھا۔مجھے خیال آیا بینر کے کپڑے کے لہرانے اور اس کے جھوم اٹھنے میں اس اطلاع کا بھی کوئی دخل ہے کہ جناب خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب اس وقت بنفس نفیس اس بینر کو دیکھ رہے ہیں۔

میر پور میں رات کے کھانے کا اہتمام ہماری شام چھ سات بجے متوقع آمد کے تحت کیا گیا تھا۔وہ سب انتظار میں تھے۔ان کی دل جوئی کے لئے دوبارہ کھانے پر بیٹھ گئے کھانا کھاتے ہوئے مجھے بدھا کا دھیان آگیا کس طرح ایک مرید کا دل رکھنے کے لئے اس نے زہریلا کھانا کھایا۔بدھا نے زہریلا کھانا کھانا پسند کیا لیکن مرید کا دل نہیں توڑا۔رات گئے ہم کاٹھ گڑھ کی طرف سدھارے۔

راستے میں نا کے پر پولیس نے گاڑی روکی۔میر پور سے ایک بھائی اور بھی شامل ہو گئے تھے اس لئے اب گاڑی میں پچھلی سیٹ پر ہم چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

’’آپ کچھ مزید لوگ بھی بٹھالاتے۔‘‘ پولیس والے نے کچھ بذلہ سنجی کا مظاہرہ کیا۔ جواب میں انہیں بتایا گیا۔ مہمانوں کو کاکڑ ٹاؤن پہنچانا ہے اور واپسی پہ اس وقت ڈرائیور کا اکیلے آنا مناسب نہ ہوتا۔ اس لئے ۔۔۔‘‘ ’’اس لئے کیا؟ آپ ذرا نیچے اتریں!‘‘ پولیس کو مناسب جواب سننا کہاں آتا ہے۔ ایک صاحب اترے۔ دوسرے اترے تیسرے اترے حاجی ادریس صاحب جز بز ہو رہے تھے ان کے مرشد کے سامنے تو یہ نہ ہوتا۔ میں نے اندھیرے میں بھی ان کے چہرے پر کچھاؤ دیکھا ابھی وہ اتر ہی رہے تھے کہ ASI نے انہیں پہچان لیا۔ وہ ان کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ اس نے حاجی صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر انہیں اترنے سے روکا۔ معذرت کی اور یہ سن کر کہ حاجی صاحب کے پیر و مرشد ان کے ہمراہ ہیں۔ وہ گھوم کر اس طرف آئے جہاں حضور تشریف فرما تھے۔ ان سے ہاتھ ملایا اور دوبارہ معذرت کی اور دعا کے لئے کہا۔ آپ نے ان کو دعا دی۔ ’’اللہ آپ کو خوش رکھے‘‘ یہ سن کر کہ یہ ASI حاجی صاحب کے کلاس فیلو رہ چکے ہیں میری ذہنی رو ملکی قوانین میں استثنیات کی طرف پھر گئی۔ ہمارے ملک میں قوانین اور استثنیات کا چولی دامن کا ساتھ جو ہے۔

آگے روانہ ہوئے تو نہ جانے کیوں مجھے سڑک دیکھی بھالی اور جانی پہچانی لگ رہی تھی پہاڑی سلسلہ شروع ہوا تو حاجی صاحب نے دور پہاڑی پر ایک بڑے سے

روشن نقطے کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ وہ روشنی کاکڑہ ٹاؤن مراقبہ ہال کی ہے۔ رات کے چاندنی بھرے اندھیرے میں دور سے وہ روشنی لائٹ ہاؤس کی تمثیل تھی۔ فقیروں کی کٹیا کی روشنی نے ہمیشہ راہ گم کردہ مسافروں کو راہ دکھائی ہے۔ قصے کہانیوں میں اندھیری راتوں میں منزلوں کے جویا مسافروں کو جنگلوں اور بیابانوں میں اسی طرح دور سے نظر آنے والی روشنی راہ دکھاتی رہی ہے۔ جو مسافر روشنی کی سمت قدم بڑھا لیتے ہیں وہ کٹیا تک پہنچ جاتے ہیں۔ کٹیا میں ان کی راہنمائی کو ایک خضر صورت راہنما موجود ملتے ہیں۔ میں نے سوچا جب ہم وہاں پہنچیں گے تو ہمیں وہاں کون ملے گا۔ ہمارہ مرشد، ہمارا ہادی، ہمارا راہنما تو خود ہمارے ہمراہ ہے۔ ''نہیں بھئی۔ وہ ہمیں اپنے ہمراہ اپنے ساتھ نہ لئے ہوتا تو یہ روشنی کیسے نظر آتی'' اور میرا دل مطمئن ہو گیا۔

مراقبہ ہال کے بورڈ پر نظر پڑی۔ اس کے پہلو میں ایک بورڈ پر چمکدار حروف میں انگریزی میں مراقبے کی دعوت پڑھ کر ''صلوٰۃ بر محمدؐ'' کا نعرہ سوجھا۔ گاڑی توقع کے خلاف بورڈ کے پاس رکے یا مڑے بغیر سیدھی چلتی چلی گئی اور پھر کاکڑہ ٹاؤن میں سے ہو کر گھومتی ہوئی پہاڑی پر چڑھ کر مراقبہ ہال میں داخل ہو گئی۔ شاید اندھیرے میں رہنے کے سبب اتنی روشنی دیکھ کر آنکھیں چندھیا گئیں یا وہاں واقعی اتنا اجالا تھا۔ گاڑی رکی۔ دروازہ کھولا گیا۔ مرشد کریم نے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے دونوں پاؤں سمیٹ کر باہر نکالے

انہیں اکٹھا زمین پر نکلا۔ اور پھر گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اور پھر کسی قدر جھٹکے سے سیدھے کھڑے ہوگئے۔ کھلا ہو چہرہ دیکھ کر وہاں کھڑے سب بھائیوں کے چہرے کھل اٹھے۔ ہار پہنائے گئے۔ عقیدتوں کے پھول نچھاور ہوئے۔ استقبالیہ کلمات کہے گئے۔ ہم کاکڑ ٹاؤن مراقبہ ہال پہنچ چکے تھے۔

****

صبح نماز فجر کے بعد مراقبہ بھی با جماعت ہوا۔ حاجی ادریس صاحب کی میزبانی کا آغاز بھی فوراً ہی ہوگیا۔ چائے آئی، ناشتہ آیا۔ ناشتے میں انڈے شامل دیکھ کر میر امراد گویا ہوا۔ ''انڈہ مکمل کولیسٹرول ہے۔ اس میں پوری مرغی چھپی ہوتی ہے پروں اور پنجوں سمیت۔'' اب میں انڈے کو دیکھتا ہوں تو سالم چوزہ بیٹھا ہوا نظر آرہا ہے۔ میں اس چوزے کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میرا ہاتھ نرم نرم پروں سے ٹکرانے کی بجائے انڈے کے سخت چھلکے سے ٹکرا گیا۔ جیسے خواب دیکھتے ہوئے آنکھ کھل جائے تو عجیب سا لگتا ہے۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے اپنے مراد کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ایک شانِ تغافل سے چائے کی پیالی اٹھائی اور چسکی لی۔ پیالی واپس پرچ میں رکھی اور کہا ''کراچی میں چائے میں دودھ ڈالا جاتا ہے یہاں دودھ میں چائے ڈالتے ہیں۔'' میں نے دوبارہ انڈے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ وہی انڈے کا انڈا۔ چنانچہ ایک بار

پھر کوشش کی ۔ نتیجہ یہ کہ میں تین انڈے کھا گیا ۔ ناشتے کے بعد دستر خوان لپیٹا گیا ۔ فرمایا ۔ ’’انسانی آنکھ سورج کو دیکھتی ہے ۔ سورج کا فاصلہ نو کروڑ میل بتایا جاتا ہے ۔ اس کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہوا کہ انسانی آنکھ کو نو کروڑ میل بلکہ اس سے بھی زیادہ فاصلے تک دیکھنے کی صلاحیت حاصل ہے لیکن انسان نے خود کو محض 24 / 25 فٹ تک محدود کیا ہوا ہے ۔ اس طرح چاند بھی دو ڈھائی لاکھ میل دور ہونے کے باوجود نظر آجاتا ہے ۔ سائنسدانوں نے نوری سالوں کے فاصلے پر دیکھنے کے لئے تو دوربین بنائی ہے مگر کوئی ایسی دوربین نہیں بنا سکے جس سے فرشتے یا جن نظر آسکیں ۔ دراصل انسان کے دیکھنے کی حد بہت ہی زیادہ ہے مگر یہ نہ تو اس سے واقف ہے اور نہ ہی اس سے کام لیتا ہے ۔‘‘

ہمیں ان باتوں پر غور کرنے کا کہہ کر آپ کمرے سے باہر نکل گئے باہر سورج طلوع ہو رہا تھا ۔ دور تک چھوٹی بڑی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں ۔ کشمیر کو یوں صبح کے وقت دیکھنا میرا خواب تھا جو آج پورا ہو رہا تھا ۔ مراقبہ ہال ایک پہاڑی ٹیلے کے اوپر بنا ہوا ہے ۔ حاجی ادریس صاحب بتا رہے تھے کہ عظیمی بھائیوں نے پہاڑ کاٹ کر یہ جگہ بنائی ہے ۔ انسانی ارادے کے سامنے پہاڑ بھی نہیں ٹک سکتے ۔ یہ بات یوں مشاہدے میں آ گئی ۔ مراقبہ ہال کا راستہ کاکڑ ہاؤن کے اندر سے ہو کر آتا ہے ۔

مراقبہ ہال کے ایک طرف کھیت نما زمین ہے اور دوسری طرف کچھ گھر۔ جس طرف گیٹ ہے وہاں سے ایک پہاڑی نیچے کی طرف ہے۔ ایک سیدھی دیوار کھیت سے گھروں تک بنی ہوئی ہے۔ باہر سے یہ دیوار آٹھ دس فٹ بلند ہوگی اندر سے یہ مراقبہ ہال کی منڈیر ہے۔ سڑک مراقبہ ہال کی سطح سے 70 / 80 فٹ نیچے ہے لیکن ساتھ والا داہنی طرف کا کھیت مراقبہ ہال کی زمین سے ایک دو فٹ بلند ہے۔ مراقبہ ہال میں ایک کمرہ کے باہر مراقبہ ہال اور دوسرے کے باہر ''حضور اباجی کا کمرہ'' کے الفاظ لکھے ہیں اب کے کمرے کی ایک کھڑکی کھیت کی طرف اور دوسری گیٹ کی جانب۔ باورچی خانہ ہال کے ساتھ اباجی والے کمرے کے مخالف سمت پیوست ہے۔ گھروں کی سمت پانچ چھ سیڑھیاں چڑھ کر وضو خانہ اور منڈیر والی دیوار کے ساتھ باتھ روم اور ٹوائیلٹ۔ حاجی صاحب مرشد کریم کو ایک ایک چیز دکھا رہے تھے۔ ٹوائیلٹ کو دیکھ کر آپ نے کہا کہ گٹر کے پائپ کے ساتھ آؤٹ لیٹ پائپ لگوائیں ورنہ بدبو ناقابلِ برداشت رہے گی۔ ان کی باریک بینی سے کوئی بات کہاں چھپی رہ سکتی ہے۔ حاجی صاحب نے اس خامی کو درست کرنے کا اقرار کیا۔

مراقبہ ہال میں داخل ہوں تو سڑک کی طرف بلکہ سڑک کے اس پار متصلا جھیل کی زمین نظر آتی ہے۔ جس طرف گیٹ ہے ادھر سے پہاڑیوں کا ایک چھوٹا سا

سلسلہ نظر آتا ہے پہاڑیوں پر ایسے ویسے کوئی درخت نہ تھے جو کشمیر کے تصور کے ساتھ میں نے وابستہ کیے ہوئے تھے۔ جھڑ بیریوں کیکر اور پہاڑی جھاڑیوں کے علاوہ کہیں کہیں ایک دو درخت۔ میرے مراد نے یقیناً میرے مایوسی دیکھ لی ہوگی جبھی تو فرمایا ''حاجی صاحب تو کشمیر کے قدموں میں پڑے ہیں۔'' اور آ کر منڈیر پر بیٹھ گئے ہم نے نیچے زمین پر نیم دائرہ بنا کر مرشد کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لینے کی سعی ناتمام کی۔ انہوں نے اردگرد نظر دوڑائی۔ ''سبحان اللہ کیا خوبصورت سماں ہے'' کہہ کر انہوں نے میری توجہ زمین کی جھاڑیوں سے مشرق میں ابھرتے سورج اور شفق رنگ بادلوں کی طرف پھیر دی۔

حاجی صاحب کو مخاطب کر کے سب کو سناتے ہوئے فرمایا۔ ''ہمیں آدم اور حوا کی بابت بتایا جاتا ہے کہ آدم لنکا میں اتارے گئے تھے اور حوا جدہ میں۔ جدہ کا نام ہی جد یعنی اجداد سے بنا ہے۔ اماں حوا کی قبر جدہ ہی میں تو بتاتے ہیں۔ اب ان دونوں کے درمیان اتنا تو مکانی فاصلہ ہوا۔ کہتے ہیں وہ پانچ سو سال تک ایک دوسرے کی تلاش کرتے رہے۔ اب اگر ان کی عمریں ہزار برس ہوں تو پانچ سو سال یہ نکال دیں۔ باقی عمر میں سے بلوغت، سن یاس اور بڑھاپا نکال کر اندازہ کریں انہوں نے کتنے سال اولاد پیدا کی ہوگی اور پھر یہ اولاد آدم سائبیریا، افریقہ، چین اور جاپان وغیرہ جیسی جگہوں پر

کہاں سے آگئی۔ اگر آدمی جدہ سے ہی نکلا تو آخر اس کیا پڑی تھی کہ وہ صائبیریا میں جا گھسا۔ وہاں کے موسمی حالات اتنے مختلف ہیں کہ عرب علاقوں کا آدمی وہاں زندہ رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ آج بھی ہم اگر وہاں جائیں تو نہیں رہ سکیں گے اچھا اب آپ یہ دیکھیں کیکر کا درخت اب کراچی میں بھی ہے۔ یہاں یہ سامنے (کشمیر میں) بھی ہے اور اسی طرح انگلینڈ میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسی طرح بادام کا درخت بھی دنیا کے ہر حصے اور ہر خطے میں ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ بادام کا پہلا بیج، کیکر کا پہلا درخت، پہلا آدم کہاں سے آیا اور زمین میں کس طرح پھیلا۔ سوچیں اور بہت سوچ کر جواب دیں۔ بھئی یہ بہت ضروری سوال ہے۔ حاجی صاحب میرے یہاں سے واپس جانے سے پیشتر مجھے اس سوال کا جواب چاہئے۔ آپ سب مل کر سر لڑائیں۔ آپ سب سوچیں اس پر ذرا رک کر بات کریں۔ دیکھیں تو سہی اصل بات کیا ہے۔''

پھر مزید جھنجھوڑنے کو ایک اور سوال اٹھایا۔ ''میدانی علاقوں میں عام طور پر پانی سو ڈیڑھ سو فٹ کی گہرائی پر نکل آتا ہے تو تین چار ہزار فٹ بلند پہاڑی علاقے میں کتنی گہرائی میں نکلے گا؟'' ہم میں سے کسی نے جواب میں کہا'' یہی کوئی سو پچاس فٹ کی گہرائی میں''

فرمایا'' کیوں ---؟ کیا اسے تین ہزار ایک سو فٹ کی گہرائی میں نہیں نکلنا

چاہیے؟'' پھر خود ہی کہا ''لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اگر آپ اوپر پہاڑ کی چوٹی پر بھی کنواں کھودیں گے تو یہی سو ڈیڑھ سو فٹ کی گہرائی پر پانی مل جاتا ہے۔ آخر کیوں؟'' وہی دعوتِ غور و فکر۔ قوم نے اسی ایک صفت کو چھوڑا اور خوار و زبوں ہوئی۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر فرمایا ''آپ یہ چٹانیں دیکھ رہے ہیں۔ یہ چٹانیں لڑھکتی، ٹوٹتی اور ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں۔ دریاؤں میں ان کی ریت بنتی ہے۔ جب یہ ریت سمندر میں پہنچتی ہے سمندر بتدریج پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے۔'' پھر فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے کائنات میں گراریاں فٹ کی ہوئی ہیں۔ پھر ہاتھوں کو حرکت دے کر دکھایا کہ چکی یوں چلتی ہے۔ لیکن پتھر اور چٹانیں اس طرح چلتی ہیں جیسے انسانی معدہ یا کار کا پہیہ۔ یعنی اوپر سے نیچے اور دوسری طرف نیچے سے اوپر۔ یہ سب حرکتیں ایک دوسرے سے یوں جڑی ہوئی چلتی ہیں کہ ایک حرکت دوسری کو جنم دیتی ہے۔ بھئی نل سے نل جڑا ہوا ہے۔''

اس کے بعد گفتگو کا رخ سمندر میں لہروں کے آپس میں ٹکرانے سے بخارات بننے۔ بخارات سے بادل بننے۔ بادلوں کا ہوا کے دوش پر اوپر اٹھنے۔ بالائی خطوں میں ٹھنڈک سے ان کے منجمد ہونے۔ ہواؤں کا بادلوں کو آپس میں ٹکرانا اور اسی طرح دبانا جیسے گیلے کپڑے کو نچوڑا جاتا ہے۔ بادلوں کی آپس میں رگڑ سے بجلیوں کا پیدا ہونا بجلیوں کے کڑکنے سے کیمیائی تبدیلیوں کا ہونا نائٹریٹس کا بننا اور پھر پانی میں حل ہو

کر برسنا اور کھاد کے اثرات رکھنا۔ بارش کے پانی کا بہتے بہتے ندی نالوں کی صورت اختیار کرنا پھر دریاؤں کی شکل میں واپس سمندر میں پہنچنے کے انتظامات کا پورا نقشہ اس تفصیل سے بیان کیا کہ نگاہوں کے سامنے ایک فلم سی چلتی رہی۔ میں نے ذہن میں موجود معلومات کی سطح میں اضافے کو لوٹ کرنے کو اپنے اندر دیکھا۔ میں نے پہلی تصحیح یہ نوٹ کی کہ بخارات سورج کی گرمی سے نہیں بلکہ لہروں کے ٹکرانے سے بنتے ہیں اور پانی صرف بلندی سے نیچے نہیں جاتا نشیب سے فراز کی طرف بھی چلتا ہے۔ یہ ندی نالے اور دریا پانی کو ایک ویکیوم کے تحت پمپ کی طرح سمندر میں پہنچا رہے ہیں اور پانی کے نمکین ہونے کی حکمت یہ ہے کہ نمکین پانی میں تعفن پیدا نہیں ہوتا۔

مرشد کامل کی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ انفس و آفاق کی نشانیوں پہ غور کرواتے کرواتے صانع اکبر کی پہچان کرا دیتا ہے۔ اس پہچان کے بعد اس کی جاں کاری اور پھر عرفان کے مرحلے طے کرواتا ہے۔ میرا شعور مجھے مراد کی تعلیم کردہ راہوں سے بھٹکانے کو یہ بتا رہا تھا کہ تم ان باتوں کو سراہو گے۔ ان پر غور کرو گے یا ان باتوں کے سنانے والے کو پیار کرو گے؟ میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہمیں اک مدھری مسکراہٹ کی چھاؤں میں لیتے ہوئے میرا مراد گویا ہوا ''اب آپ اپنی شعر و شاعری کریں'' اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔

حاجی ادریس صاحب نے فرمایا ''آپ یہاں کا پروگرام کچھ ایسا رکھیں کہ میں جب چاہوں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا جاؤں اور جب چاہوں آپ لوگوں سے مل لیا کروں۔ یہ بات حضور نے تھکنے سے بچنے کے لئے کہی ہوگی حاجی صاحب کے ذہن سے جانے کیا گزرا کہ فرمایا ''جی ہاں۔ اب میں تھوڑا سا بداخلاق ہوگیا ہوں'' یہ بات کچھ اتنی معصومیت اور بے ساختگی سے فرمائی کہ سب ہنس دیئے۔

لوگ صبح ہی صبح جوق در جوق آنا شروع ہوگئے۔ میرے مراد کی مصروفیت کا دوسرا دور شروع ہوگیا۔ ممتاز علی اور میں گیٹ کے اندر بائیں ہاتھ بنے Mural کو دیکھ کر کاکڑ ہاؤن مراقبہ ہال کے ساتھیوں کی مصورانہ صلاحیتوں کی بات کر رہے تھے۔ حاجی صاحب آنے والے لوگوں کو مراقبہ ہال کے اندر بٹھا کر ہمارے پاس آن کھڑے ہوئے۔ ممتاز علی حیدر آباد مراقبہ ہال کے انچارج ہیں۔ انہیں مراقبہ ہال کی انتظامی ضرورتوں کے حوالے سے درکار صلاحیتوں کا مجھ سے کہیں زیادہ ادراک تھا۔ وہ حاجی صاحب کی منتظمانہ صلاحیتوں کا اعتراف کر رہے تھے۔ ان کے ساتھیوں میں کام کے دوران ایک نظم ایک ضبط کا احساس ہو رہا تھا۔ کام جیسے خود بخود ہو رہے تھے۔ حاجی صاحب سے بار بار پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی انہوں نے ایک سسٹم بنا دیا تھا اور کام اس کے مطابق ہو رہے تھے۔ ہمیں چائے بھی بار بار مل رہی تھی۔

جب مرشد کریم لوگوں سے مل رہے تھے مریضوں کو دیکھ رہے تھے لوگوں کے مسئلے مسائل حل کر رہے تھے۔ ہم کاکڑہ ٹاؤن دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ مراقبہ ہال سے ایک بھائی ہمراہ ہو لئے۔ ایک بازار۔ چند ایک بینکوں کی برانچیں۔ زیادہ تو لوگ ملک سے باہر ہیں۔ جو یہاں ہیں وہ کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا دھندا کر رہے ہیں۔ جو صاحب مراقبہ ہال سے ہمارے ساتھ چلے۔ راستے میں انہوں نے ہماری میزبانی کی۔ ہمیں قلفیاں پلائیں۔ پھر اپنے گھر لے گئے اپنے گھر لے جا کر انہوں نے ہمیں نہانے کی دعوت دی ہم نے جب دعوت کو کچھ زیادہ توجہ نہ دی تو اصرار شروع کر دیا۔

''پانی گرم ہے آپ نہالیں۔''

ممتاز علی جزبز ہونے لگے۔ ''واہ یہ اچھی زبردستی ہے۔ نہالیں واہ۔''

''اچھا آپ نہالیں تو آپ کو چائے پلائی جائے'' انہوں نے لالچ دیا۔

''بھائی آپ چائے پلادیں ہم وہیں مراقبہ ہال جا کر نہالیں گے۔'' ممتاز علی نے کہہ ہی دیا۔

مگر وہ اپنی بات پر مصر'' آپ نہالیں۔'' اچھا خاصہ کھلا سا گھر تھا۔ ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ اندر جاتے پھر آ کر اطلاع دیتے۔ ''میں نے چیک کر لیا ہے پانی گرم ہے'' ممتاز بھائی اور میں نے پہلے تو آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو ''پہلے

آپ" کہا پھر کھل کر کہنا شروع کر دیا۔ کہ پہلے آپ نہالیں تو میں دیکھوں گا، ہمارے میزبان نے مداخلت کی ''نہانا تو دونوں ہی کو ہے آپ بے شک باری باری نہائیں یا اکٹھے۔"

''اکٹھے؟'' ممتاز علی نے شپٹا کر پوچھا۔

میزباں نے کوئی اثر لئے بغیر کہا'' آپ دونوں کے لئے الگ الگ باتھ روم کھلوا دیے ہیں" ممتاز علی نے کندھے اچکائے اور نہانے چلے گئے۔ میں نے میزبان سے پوچھنا چاہا کہ وہ ہمارے نہانے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں انہوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ ممتاز علی آ گئے تو میں نہانے چلا گیا۔ واپس آیا تو ممتاز علی ہنس رہے تھے اور چائے کے ٹھنڈے ہونے پر خوشی کا اظہار فرما رہے تھے۔ میں نے میزبان کے سامنے مہمانی کا حق آسائش استعمال کرتے ہوئے پوچھا۔ آپ نے یہ چائے کا تکلف کیو کیا؟'' فرمایا حاجی صاحب نے کہا تھا'' مہمانوں کو گھر لے جا کر گرم پانی سے غسل کروالاؤ۔'' میں موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ کی تواضع کو چائے بنوا دی"۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' ممتاز علی نے پوچھا۔

''ساتھ میں برج بھی بتا دیں۔'' مجھ سے رہا نہ گیا۔

چوہدری اختر صاحب نے نام بتا کر کہا۔''برج؟ وہ کیوں؟ وہ تو مجھے معلوم

نہیں۔'' ہم نے بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔

تو یہ بات تھی۔ وہ بے چارے حاجی صاحب کے حکم پر ہمیں نہلانے لائے تھے ''لیکن اگر یہ ہمیں پہلے بتا دیتے تو ہم اتنی لیت و لعل تو نہ کرتے''۔ میں نے ممتاز علی سے بہت بحث کی مگر یہی سمجھ میں آئی کہ وہ حیدرآباد اور پشاور سے آئے ہوئے ان معزز مہمانوں سے اپنی بات وضاحت سے نہ کر سکے جو ان کے مرشد کریم کے ہمراہ ہونے کے خصوصی اعزاز سے بھی مشرف تھے۔ ''لیکن ہم تو کاکڑ ماؤن دیکھنے نکلے تھے یہ نہانا تو ہمارے شیڈول میں نہ تھا۔'' ممتاز علی بہت حوصلے والے آدمی ہیں انہیں میرا اس طرح بار بار نہانے پر بحث کرنا بھی برا نہیں لگ رہا تھا بلکہ وہ تو الٹا لطف لے رہے تھے۔

''پانی واقعی گرم تھا۔''

''نہانے کا لطف آ گیا۔''

''چائے البتہ ٹھنڈی تھی۔''

''وہ تو آپ نے دیر کر دی۔''

''تو آپ پہلے چائے پلا دیتے نا''

''نہائے بغیر چائے۔۔۔؟''

میزبان کی سمجھ کی داد دیتے ہوئے ہم اپنی نا سمجھی کو کوسنے لگ گئے اور پھر

حاجی صاحب کی انتظامی صلاحیتوں کا تجزیہ کرنے لگ گئے ۔

''ممتاز بھائی ۔ یہاں کہیں چنار کے درخت نظر نہیں آ رہے ۔ کیا یہ واقعی کشمیر ہے؟ '' ۔ میں رہ نہ سکا ۔ میرے اندر کشمیر کی جو تصویر تھی یہ کاکز ہ وادی تو اس سے بالکل بھی مطابقت نہ رکھتا تھا ۔ ''اور تو اور یہاں تو چیڑ ھ کے بھی درخت نہیں ۔'' ممتاز علی نس دیئے ''تو آپ اپنی تصویروں کی تلاش میں ہیں'' انہوں نے بڑی سادگی سے پوچھا ۔ میں نے سوچا بات تو ٹھیک ہی ہے جو سامنے ہے اس کو دیکھو ۔ جو دیکھنا چاہتے ہو جب دکھانے والا دکھائے گا وہ بھی دیکھ لینا ۔

دوپہر کھانا کھا کر آرام کیا گیا ۔

شام کو مراقبہ ہال میں ۔۔۔ مغرب سے قدرے پہلے ۔۔ مرشد کریم باہر آئے اور باہر آ کر لان میں بیٹھ گئے ۔ وہاں جتنے بھی لوگ تھے سب آ کر حضور کے گرد جمع ہو گئے ۔

کسی نے نماز کی بابت سوال کیا تو فرمایا '' جب اللہ اکبر کہہ دیا تو آپ کے ذہن سے ہر شے کی بڑائی نکل جانی چاہئے ۔ نماز کے دوران کسی اور چیز کا دھیان آ گیا تو اس کا مطلب ہوا وہ شے بڑی ہو گئی اور اللہ کی بڑائی پس پشت چلی گئی ۔''

پھر کتاب '' تجلیات '' منگوائی اور ایک بھائی کو دے کر اس میں سے پڑھ کر

سنانے کو کہا۔ جب ایک پیراگراف پڑھ لیا گیا تو پوچھا ”آپ نے کیا پڑھا؟“ یہ سوال کئی بار کیا۔ پھر دوبارہ پڑھوایا۔ پھر پوچھا۔ ”جی تو آپ نے کیا پڑھا؟“ پڑھے گئے پیرا گراف کا خلاصہ سن کر” حاجی صاحب آپ یہاں باقاعدہ کلاسیں شروع کریں۔ کلاسوں میں حاضری کو باقاعدہ بنانے کو یقینی کریں۔ نہ مانیں تو جرمانہ کریں۔ پھر بھی نہ مانیں تو نکال دیں۔ بھیڑ اکٹھی کر کے کیا کرنا ہے۔ آپ کوان کی تربیت کرنا ہے۔“

اسی دوران فیاض صاحب آئے۔ ان کی کمر میں شدید درد تھا۔ انہیں گاڑی میں لٹا کر لایا گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے مرشد کریم کے قدموں میں لٹا دو میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ پھر ایک شعر پڑھا۔ پیر امراد اپنی چھتنار مسکراہٹ پھیلائے انہیں دیکھتا رہا۔ شعر میں سوز و گداز اور محبوب سے اپنے قدموں میں پڑے رہنے دینے کی التجا تھی۔ فیض صاحب سے میں پہلے بھی مل چکا تھا۔ وہ قصہ شاہ ملوک پڑھنے میں ایک خاص آہنگ رکھتے ہیں۔ مراد نے بڑی ہی توجہ سے انہیں دیکھا۔ وہ اس سے سیراب ہو گئے۔

ایک ہندو کا واقعہ سنایا کہ اس کو اللہ کی کھوج لگ گئی۔ کسی نہ کہا جنیو پہنو اس نے پہن لیا۔ کسی نے کہا قشقہ لگاؤ اس نے لگا لیا۔ کسی نے کہا ختنہ کرواؤ گے تب اللہ ملے گا۔ کسی کے کہنے میں آ کر بالے پہن لئے۔ کسی کے کہنے پر کڑے۔ وہ حضور قلندر بابا اولیاؒ سے بھی آ کر ملے تھے۔ کبھی قرآن پڑھتے کبھی گیتا کے اشلوک اور کبھی گرنتھ صاحب

کے پاٹ ۔ ڈنڈے سے کڑے بجا بجا کر پڑھتے ۔ انہیں کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا ۔ مدتیں اس چکر میں پھرنے کے بعد پریشانی سے کھسک گئے تھے ۔ ان صاحب کی محرومی کا سن کر مجھے بہت ترس آیا ۔ میں نے عرض کی ''حضور ان کے ساتھ تو بری ہوئی ۔ وہ تو اپنی جگہ مخلص تھے ۔ انہوں نے تو پوری کوشش کی ۔ انہیں اللہ کیوں نہیں ملا؟'' فرمایا ''کسی ایک طرف کے ہو جاتے تو اللہ ملتا ۔ انہوں نے اللہ کو خود تک آنے ہی نہیں دیا ۔'' میرے حیرت کی انتہا نہ رہی ۔ یعنی سلوک کی راہوں میں خلوص کے بعد استواری بھی شرط ہے نہ خلوص کے بنا کچھ ملتا اور نہ استواری کے بغیر ۔

کسی نے مٹھائی پیش کی تو فرمایا ''شجر ممنوعہ یہ مٹھاس ہی تو ہے ۔ انسان کی پوری مادی زندگی مٹھاس پر ہی تو قائم ہے ۔ آکسیجن بھی تو مٹھاس ہی ہے ۔ درختوں میں جو بھی عمل ہو رہا ہے وہ بھی مٹھاس ہی ہے ۔ جب انسان کومہ میں جاتا ہے تو اس کو آکسیجن اس لئے دی جاتی ہے کہ مٹھاس کو کمی فوراً پوری کی جا سکے ۔ مٹھاس ترک کرنے سے انسان کے دیکھنے کی سکت بڑھ بڑھ جاتی ہے ۔''

ایک صاحب کا واقعہ سنایا کہ وہ انہیں گوجرانوالہ میں ملے تھے ۔ وہ بیس سال تک ہندوؤں اور تبتی لاماؤں اور یوگیوں کے چکر میں رہے ۔ آخر میں ان کی یہ حالت تھی کہ نہ وہ شور برداشت کر سکتے تھے نہ ہی کچھ کھا پی سکتے تھے ۔ ایک خاص قسم کا چاول

کھاتے تھے اور اس کو کھانے کے بعد انہیں بھوک بھی نہیں لگتی تھی۔ فرمایا ''میں نے ان سے پوچھا کہ کچھ کامیابی بھی ہوئی یا نہیں۔ وہ رو پڑے اور بتایا کبھی کبھار ہلکی سی روشنی نظر آتی ہے اور کچھ نہیں۔''

اسی نشست میں فرمایا ''علامہ عنایت حسین مشرقی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ مولویوں کو ختم کر دینا چاہئے لیکن اس تمام تر مخالفانہ سوچ کے باوجود بھی انہوں نے اسی کتاب میں اس بات کو تسلیم کیا کہ نماز اور اذاں کا سسٹم انہی مولویوں کے دم قدم سے قائم و دائم ہے۔'' پھر ان کی تحریک اور ان کی ذات کے حوالے سے کئی باتیں ارشاد فرمائیں کہ وہ ڈسپلن کے بہت سخت تھے اور یہ بھی بتایا کہ ایک بار مجھے ان کے جلسے میں جو کراچی میں ہوا تھا شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ اس جلسے میں انہوں نے کہا کہ میں چالیس سال سے قبرستان میں اذان دے رہا ہوں اور کوئی مردہ زندہ نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جو کچھ کہتا رہا ہوں اس پر خود عمل نہیں کیا۔ فرمایا ''یہ بہت بڑی اور بڑائی کی بات ہے کہ اتنے بڑے مجمع میں آدمی اپنی غلطی تسلیم کرے اور اس کا اظہار بھی کر دے۔

پھر ایک واقعہ اور بھی سنایا۔ فرمایا ''ایک گاؤں میں ایک مولوی گیا وہاں اس نے دیکھا کہ لوگ محض نام ہی کے مسلمان ہیں۔ اس نے انہیں نماز وغیرہ پر تو لگا لیا۔

رمضان قریب آیا تو مولوی صاحب نے لوگوں کو کہا کہ رمضان آ رہا ہے آپ کو روزے رکھنا ہوں گے۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ روزے کیا ہوتے ہیں؟ اس نے بتایا کہ دن بھر کھانا نہیں کھانا وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے پوچھا رمضان آئے گا کدھر سے؟ مولوی صاحب اس کا کیا جواب دیتے۔ کہہ دیا۔ مغرب سے۔ مولوی صاحب آگے چلے گئے۔ وہاں اس گاؤں میں ایک روز ایک اونٹ آیا۔ دیہاتیوں نے اس سے پہلے کبھی اونٹ دیکھا نہ تھا۔ انہوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ ایک نے کہا ہو نہ ہو یہ رمضان ہے۔ انہوں نے اس مار کھایا۔ مولوی صاحب واپس آئے انہیں کھاتے پیتے دیکھ کر پوچھا تم لوگوں نے روزہ نہیں رکھا۔ انہوں نے کہا ہم نے رمضان کو ہی مار کر کھا لیا ہے اب وہ ہمیں کھانے سے کیسے روک سکتا ہے؟۔

ایک صاحب نے اخروٹ کی لکڑی کی سیاہ رنگ کی کشمیری طرز کی لاٹھی تحفتاً دی۔ لیکر دیکھا کہا اچھی بنی ہوئی ہے۔ پھر فرمایا۔ ''ابھی تو میں اتنا بوڑھا نہیں ہوا۔ آپ نے مجھے اتنا بوڑھا سمجھا کہ مجھے لاٹھی کی ضرورت آن پڑے۔ انہوں نے کہا لوگ سہارے کے لئے رکھتے ہیں۔ فرمایا ''سہاروں سے تو یقین متاثر ہوتا ہے۔ سہارے نہیں لینے چاہئیں۔'' ان صاحب نے کہا آپ دعا کریں۔ فرمایا ''عمل کے بغیر محض دعاؤں کے سہارے نہیں بیٹھے رہنا چاہئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بدر اور خندق کے مواقع پر

اپنا عمل پورا کرنے کے بعد ہی دعا فرمائی تھی۔

مغرب کی نماز تک یہ محفل رہی۔ فیاض صاحب اس دوران نیم دراز لیٹے مرشد کریم کو دیکھتے رہے۔ شام کو نماز کے بعد انہیں رخصت کرتے ہوئے حضور نے انہیں کہا آپ ہمت کریں۔ دل چھوٹا نہ کریں اور وہ قدم قدم چل کر گاڑی تک گئے ان کے جانے کے بعد آپ نے تبصرہ کیا یہ ہمت ہار بیٹھے ہیں اور کوئی مسئلہ نہیں۔

شام کو حاجی ادریس صاحب مرشد کریم کو منگلا کی جھیل دکھانے لے گئے۔ جھیل کی جگہ ایک چٹیل میدان دیکھ کر فرمایا۔ ''شاید مجھے پانی کی یہی صورت حال دیکھنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔'' وہاں دیکھا کہ جھیل کی تہہ کی زمین پر لوگوں نے گندم کاشت کی ہوئی ہے اور آج کل وہ اس کی کٹائی اور اس کے سنبھالنے کے لئے بندوبست کر رہے ہیں۔ اس خشک سالی کے حوالے سے کسی نے کہا دعا کریں کہ بارشیں ہوں۔ اس پر وہاں موجود ایک صاحب بول اٹھے'' آج کل بارشیں ہوئیں تو گندم بھیگ جائے گی۔'' اور وہاں سے ہٹ کر چل دیئے۔ جب انسان انفرادی سوچوں کی حدود میں مقید ہو جائے تو اسے دوسروں کی سیرابی سے زیادہ اپنی گندم کے بھیگنے کی فکر رہتی ہے۔

بات چیڑ ھ اور چنار کے درختوں سے ہوتے ہوئے اخروٹ کے درختوں تک آ گئی تو فرمایا'' سب سے کم کھایا جانے والا ڈرائی فروٹ اخروٹ ہے۔ اخروٹ

کھانے سے سر کے بال تک اڑ جاتے ہیں۔'' چونکہ بالوں کا تعلق خون کی کثافت سے ہوتا ہے اس لئے پوچھ کہ حضور کیا اس سے کثافت کم ہو جاتی ہے تو بتایا کہ نہیں بلکہ یہ تو کثافت میں اتنا اضافہ کر دیتا ہے کہ مسام بند ہو جاتے ہیں اور اس سبب بال جھڑ جاتے ہیں۔البتہ یہ دماغ کے لئے مفید بتایا جاتا ہے۔

پھر گفتگو موسم کے حوالے سے ہونے لگی۔کشمیر میں آ کر بھی حبس کی کیفیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا'' یہاں ہوبوجھل ہے۔اس لئے رکی ہوئی ہے۔'' پھر فرمایا۔ ''گرمی میں کام نہیں ہو پاتے۔ایجادات بھی سرد ممالک میں ہی ہوتی ہیں۔آپ کوئی ایجاد بتائیں جو گرم ممالک سے تعلق رکھتی ہو۔''

رات کو آپ کا کزن ناؤں میں دو چار گھروں میں گئے۔ہم وہیں مراقبہ ہال میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔حاجی صاحب اور ایک دو دوست ہمراہ گئے تھے۔ہم دیر تک منتظر رہے پھر مراقبہ ہال سے نکل کر بازار کی طرف جا رہے تھے کہ سامنے سے اپنے مراد کو حاجی صاحب کے ہمراہ آتے دیکھا۔آتے ہوئے کسی مولوی صاحب کا قصہ سنا رہے تھے۔بزار سے مراقبہ ہال تک کی گلی میں گزرتے ہوئے قصہ جو وہ سنا رہے تھے۔ یہ تھا کہ ایک مولوی صاحب تھے جب کہیں کوئی مر جاتا یہ اس کے ہاں پہنچ جاتے۔اپنے ساتھ دو گدھے بھی لے جایا کرتے۔وہاں پہنچ کر مرحوم کے لواحقین سے کہتے خدا بخشے

آ تا ر سے مرحوم کوئی اچھے آدمی نہیں لگتے نہ جانے آگے ان کا کیا حشر ہو رہا ہوگا ۔اگر چاہو تو میں مرحوم کے گناہ اپنے سر لے لوں ۔لواحقین مرحوم کی ہمدردی میں فوراً راضی ہو جاتے یہ کہتے ہیں پرائے گناہ کی آگ میں جلوں گا آپ مجھے کیا دیں گے ۔خیر جی کسی نہ کسی طرح سودا ہو جاتا اور وہ گدھوں پر اناج اور دیگر اسباب لاد کر چل دیتے ۔"

میں یہ بات سن کر بہت حیران ہوا اور سوچا کہ مولوی صاحب تو مارے گئے بے چارے ۔نہ جانے کیسے کیسے لوگوں کے گناہ انہوں نے اپنے سر لئے ہوں گے ۔ان کا وہاں کیا حشر ہو رہا ہوگا ۔بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا" حضور یہ مولوی صاحب نے کیا کیا؟وہ بے چارے تو مارے گئے ہوں گے ۔دنیا کے لالچ میں ۔"فرمایا" کیا کیا؟ بھئی ایک کے اعمال کسی دوسرے کے گلے پڑ ہی نہیں سکتے ۔کوئی کسی کے گناہوں کے لئے جواب دہ نہیں ہو سکتا یہ تو اندھیر نگری ہو جائے گی اگر یہ مان لیا جائے ۔مولوی صاحب تو لوگوں کو بے وقوف بناتے تھے ۔" میں تو یہ سن کر بالکل ہی چکرا کر رہ گیا ۔عرض کی" لیکن حضور انہیں لوگوں کو بے وقوف بنانے کی سزا تو ملے گی نا ؟"فرمایا ۔" بے وقوف بننے کی سزا تو ملی لوگوں کو ۔بے وقوف بنانے کی کیا سزا ۔وہ کون سا یہ دولت ساتھ لے گئے"

مرشد کریم کس کس طرح ہماری سوچوں کو درست فرماتے ہیں کس طرح ہماری طرز فکر میں موجود خام کاریوں کی نشاندہی فرماتے انہیں دور فرماتے ۔باتوں

باتوں میں کیسی کیسی حکمتیں تعلیم فرماتے۔ کس طرح غیر محسوس طریقے سے ہماری تربیت فرماتے میرا سر عجز و نیاز سے بارگاہ رب العالمین میں جھک گیا کہ اس نے مرشد کامل کی صحبت سے سرفراز کیا اور ان کی شفقتوں کے چند چھینٹے مجھ نا چیز کا بھی مقدر بن گئے۔

اگلی صبح بھی گزشتہ صبح کشمیر سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ مراقبہ کے بعد ناشتہ اور ناشتے کے دوران مرشد کریم کی طرف سے افکار کے موتی تواضع کے لیے موجود۔

آپ نے دعا پڑھی ربنا آتنا فی الدنیا۔۔۔الخ اور اس کی شرح کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واشگاف الفاظ میں یہ بات طے فرما دی ہے کہ اگر دنیا اور آخرت میں حسن اور توازن نہیں تو آخرت میں آگ سے نجات نہیں۔''

نہ جانے کہاں سے ایک بھولا بسرا سوال سطح ذہن پر نمودار ہوا اور بارگاہ مراد میں پیش کر دیا۔ ''قرآن میں مذکورہ دعائیں لفظ رب، ربی یا ربنا سے آغاز ہوتی ہیں جب کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقولہ ادعیہ ماثورہ لفظ اللّٰھم سے آغاز ہوتی ہیں۔ اس فرق میں جو راز اور حکمت پوشیدہ ہے اس کی وضاحت فرما دیں'' یہ میرا مشاہدہ اور تجربہ ہے اگر کبھی کسی نے ان سے کوئی ایسا سوال پوچھا جس کے پوچھنے سے پیشتر اس نے خود اس پر بہت غور کیا ہو یعنی اپنا ہوم ورک اچھی طرح کرنے کے بعد سوال پوچھا گیا ہو تو مرشد کریم کے چہرے پر مسکراہٹ نہ صرف گہری ہو جاتی ہے بلکہ اس میں شفقت کا

رنگ اور بھی گہرا ہو جاتا ہے اور آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک جواب سے پہلے سوال سراہے جانے کا پتہ دیتی ہے۔ آپ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا ''رب کا لفظ وسائل مہیا کرنے والی ذات کے لئے اور اللہ اس ذات کا ذاتی نام۔ ایک میں وسائل اور دوسرے میں وسائل پیدا کرنے والی ذات۔ ایک میں طلب وسائل اور دوسرے میں ذاتی تعلق۔'' اور پھر یہ کہہ کر سراہا ''آپ کے کہنے پر میں نے سوچا۔ جو سمجھ میں آیا بتا دیا ہے۔''

میرے مراد کا یہ ایک ایسا عجیب انداز ہے جس پر میں ہمیشہ عش عش کر اٹھتا ہوں۔ وہ کتنی ہی بڑی بات کہیں۔ کتنا بڑا انکشاف کریں ان کے انداز میں کبھی بلند آہنگی نہیں ہوتی یعنی بات کی اہمیت کو وہ لہجے کی بلندی سے واضح نہیں کرتے۔ بات اپنی معنویت کے لحاظ سے کتنی ہی وزن دار کیوں نہ ہو یا کتنی ہی زبردست اہمیت کی حامل کیوں نہ ہو کتنا ہی نیا انکشاف کیوں نہ ہو وہ بات کو اتنے ہموار اور نرم انداز میں بیان فرمائیں گے کہ اگر سامعین بیدار اور آگہی حاضر اور یکسوئی نہ ہو تو مفہوم کا ایک بھی موتی ہاتھ نہ آئے۔

پھر ایک صاحب کا ذکر کیا کہ جب کوئی ان سے دریافت کرتا ''اے میاں کیا کر رہے ہو؟ تو جواب میں کہتے ''نہ کہیں آ رہا ہوں نہ کہیں جا رہا ہوں۔ بس کھڑا کھڑا

پچھتا رہا ہوں۔"

سب سن کر ہنس پڑے۔ میرا دل دھڑکا نہ جانے یہ ہم میں سے کس کی طرف اشارہ تھا۔ شاید مجھی سے کہا جا رہا تھا۔

اسی نشست میں بتایا "چین میں ایک بار فیصلہ کیا گیا کہ پرندے اتنا اناج کھاتے ہیں اگر انہیں بھگا دیا جائے تو وہ تمام اناج بچ جائے گا۔ جو ان کی خوراک بنتا ہے۔ لہٰذا ساری قوم ٹین کنستر لے کر نکل کھڑی ہوئی۔ پرندے شور سے بہت گھبراتے ہیں جب لگاتار کئی دن تک ٹین کنستر بجے تو پرندے وہاں سے نقل مکانی کر گئے۔ اس سال فصلوں کو کیڑا لگ گیا۔ سارا اناج غارت ہوا۔ اب انہیں سمجھ آئی کہ پرندے ان کا اناج کھاتے نہیں بلکہ بچاتے تھے۔ پھر میٹنگ ہوئی فیصلہ ہوا پرندوں کو واپس لایا جائے۔ چنانچہ پرندے امپورٹ کر کے چین میں لائے گئے۔"

میں قرآن کے الفاظ "اخاف ربہ" کے الفاظ میں خوف خدا کے مفہوم کی وضاحت کو پوچھا اس پر فرمایا، لاخوف علیھم، کی موجودگی میں 'اخاف ربہ' تو قرآن میں اختلاف کی علامت ہوا۔ یعنی یا تو آپ قرآن میں اختلاف مانیں اور یا پھر اپنے ذہنوں میں الفاظ کے مفہوم کو سیدھا کریں۔" ہم سبحان اللہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

پھر کسی طرح کیمیا گری کا ذکر شروع ہو گیا۔ فرمایا "کبھی کسی سے سونا بنا تو

ہے نہیں ہر بار یہی کہتے ہیں کہ بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔'' پھر تذکرہ غوثیہ سے کیمیا گری کے حوالے دو واقعات سنائے اور پھر فرمایا ''حضور قلندر بابا اولیاؒ نے مجھے سونا بنانا سکھایا تھا۔۔۔مگر ساتھ میں یہ شرط لگا دی کہ جب تک تین دن کا مسلسل فاقہ نہ ہو جائے بنانا مت۔''

ایک اور بات یہ فرمائی ''اگر ہم منصور حلاج کے وقت میں ہوتے تو اس سے ایک سوال پوچھتے کہ تم حق ہو تو کیا خالق بھی ہو یا مخلوق۔ ان کو کوئی یہ بات سمجھا دیتا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے۔ مانا انسان قرب میں سرفراز ہو تو اللہ کی صفات اس میں منتقل ہو جاتی ہیں مگر اس سے آدمی خدا تو نہیں بن جاتا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑھ کر اور کون ہوگا مگر انہوں نے تو ایسی کوئی بات نہ کہی۔ ہاں اللہ نے کہا۔ ہم نے انہیں اپنے اتنا قریب کیا کہ دو کمانوں یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ منصور کو اپنے مخلوق ہونے اور پیدائش کے بارے میں سوچ لینا چاہیے تھا۔ وہ یہ کہہ لیتے میں اللہ جیسا ہو گیا ہوں۔ بایزید بسطامی اور بڑے پیر صاحب ان سے کہیں زیادہ آگے کی منزل پر تھے انہوں نے تو ایسا کچھ نہیں فرمایا۔''

''انا الحق'' کے حوالے سے میں نے سینکڑوں مباحث سنے اور پڑھے تھے مگر اس طرح کی مدلل، دوٹوک اور سیدھی سچی رائے نہ کبھی سنی اور نہ ہی کبھی پڑھی تھی اس دن

منصور حلاجؒ کے ماورائی سے تصور میں ہے جیسے ساری ہوا نکال کر رکھ دی گئی ہو۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا جیسے میرے فہم اور شعور کا دائرہ کچھ پھیل سا گیا ہو۔ اتنے میں حاجی ادریس صاحب نے متوجہ کیا کہ کچھ مریض خواتین آئی ہیں اباجی'' ہاں ہاں کیوں نہیں!'' کہہ کر اس طرف کا رخ کیا جدھر خواتین کے لئے بندوبست تھا۔

ہم آپس میں گفتگو کرتے رہے پھر سیر کرنے نکل کھڑے ہوئے ممتاز علی صاحب نے تجویز کیا آج اس طرف چلیں یعنی کچے راستوں سے پگڈنڈی سے گزر کر ہم نیچے سڑک پر اترے۔ سڑک کے کنارے بے فکری سے ٹہلتے ہوئے عجیب فراغت کا سا احساس تھا۔ ہم تھوڑی دور گئے تو ایک ہوٹل پہ نظر پڑی فاروق صاحب نے جو افسر مہمانداری کے فرائض سرانجام دے رہے تھے ہوٹل والے کو تین کپ چائے پلانے کا حکم صادر کیا۔ بادلوں کو دیکھ رہے تھے کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ ہم نے درخت کے نیچے کرسیوں کو چھوڑ کر برآمدے میں جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ بوندا باندی ختم ہوگئی۔ کھل کر بارش ہو جاتی تو لطف آ جاتا۔ چائے پی۔ دودھ میں چائے ڈال کر دودھ پتی بنائی گئی تھی۔ اس چائے سے کسی طور طلب پوری نہیں رہی تھی۔

کافی دیر سڑک پر ٹہلنے کے بعد مراقبہ ہال واپس آئے۔ مرشد کریم لوگوں میں گھرے ہوئے ان کے مسائل پر مشورے اور علاج تجویز کر رہے تھے۔ جب آنے

والے کی دلجوئی۔ ہر بیمار کی شفا کی فکر۔ ہر مریض کی صحت یابی کے لئے کوشاں، ہر پریشان حال کے لئے دعا گو۔ میرے مراد نے کہا ''جی اچھا۔'' ان کی تسلی نہ ہوئی۔ انہوں نے جب کچھ دیر بعد تیسری بار اپنی بات دہرائی تو حضور نے کہا۔ ''دیکھیں صاحب! میرا کام ہے ڈاک پہنچانا۔ میں تو ڈاکیا ہوں اور میں اپنا کام پوری دیانت داری سے کر دیتا ہوں۔ آگے وہ کیا جواب دیتے ہیں یہ آپ کا اور ان کا معاملہ ہے۔''

ہم کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتے رہے پھر باورچی خانے میں جا بیٹھے۔ باورچی خانے میں بیٹھے کھانا پکتے دیکھتے رہے۔ ساتھ میں باتیں بھی ہوتی رہیں۔ کسی کو ہمارا باورچی خانے میں آنا ناگوار نہیں ہوا۔ کوئی جز بز نہیں ہوا۔ کسی نے کام میں ہرج ہونے کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ الٹا ہماری پذیرائی کی۔ ہمارے لئے جگہ بنائی۔ پھر چائے کا پوچھا گیا بلکہ اصرار کر کے جس طرح کی چائے پیا چاہ رہے تھے بنا کر پلائی گئی۔ ممتاز بھائی نے کہا اس بات سے اندازہ کرلیں کہ حاجی ادریس صاحب کا ذہن کیسا ہے؟، میں نے خیال کیا کہ حاجی ادریس صاحب میں یہ بات ہے کہ وہ ہر بات مرشد کریم پر چھوڑتے ہیں۔ اپنی عقل، اپنے ذہن کا زیادہ استعمال نہیں کرتے۔

ہم باورچی خانے میں بیٹھے تھے کہ حضور وہیں آ گئے۔ اس وقت میں روٹیاں کاٹ رہا تھا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟'' عرض کی روٹیاں تیار کر رہا ہوں۔ فرمایا ''روٹیاں بانٹنے

والے کو لانگری کہتے ہیں۔ لیکن ادھر انڈیا میں ہمارے یہاں اس کو بھولا بھنڈاری کہتے ہیں۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا ''آپ بھولا بھنڈاری ہیں!'' اس کہنے میں کچھ ایسی بات تھی کہ جی باغ باغ ہو گیا۔

فرمایا'' لگتا ہے یہاں وقت ٹھہر گیا ہے۔ وقت کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ وقت تو وہی رہتا ہے۔ ذہن میں مصروفیت نہ ہونے کے باعث یوں لگتا ہے کہ وقت رک گیا ہے۔ قید تنہائی میں بھی تو یہی ہوتا ہے۔ وہاں اوپر بھی جن کے پاس کام نہیں ہوتا وہ لڑتے ہیں۔ ڈنڈے چلاتے ہیں۔ بڑے حضرت کے دولوا سے تھے وہ انہیں کو پڑھاتے رہتے تھے۔ تکوین والوں کو تو خیر بالکل بھی فرصت نہیں ہوتی۔ عام آدمی کبھی ادھر بیٹھ گیا۔ کبھی ادھر بیٹھ گیا۔ کبھی فرشتوں سے گپ شپ ہو گئی۔ کبھی اولیا کرامؒ کی صحبت میں بیٹھ گیا۔ وہ لوگ جو جنگل میں تنہائی کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کی مصروفیات اگر تو ایسی ہو گئیں کہ وہ اللہ کے چکر میں پڑ گئے تو ٹھیک ورنہ گئے کام سے۔ یہ جو نماز روزے کی مصروفیت ہے یہ بھی ایک مصروفیت ہی ہے۔ ذہن میں مصروفیت ہو تو وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ دھیان وقت کے پوتوں سے ہٹا رہتا ہے۔''

باورچی خانے میں بیٹھے کھانا پکاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں ساتھ ساتھ مشورے بھی دیئے جا رہے ہیں۔'' اس میں اب سبزی ڈال دیں۔ یہ چیز دھولیں۔ اب

ڈھکن رکھ دیں۔چمچ ہلائیں۔اس کو چکھ کر دیکھ لیں نا۔" اور اسرار و رموز کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔کشمیری لوگوں کی عادات اور سادگی مزاج پر بھی بات ہو رہی ہے۔"شہری زندگی کی نسبت ان لوگوں میں الجھن اور پریشانیاں کم ہوتی ہیں۔وہ جفاکش زیادہ ہیں۔"
اگلے روز ہم نے پکنک پر جانا تھا۔اس کے انتظامات کی بابت دریافت کیا۔"وہیں جا کر پکائیں گے پکا کر ساتھ رکھنے کے بجائے یہ بہتر رہے گا۔" ساتھ ساتھ سوالوں کے جواب بھی ارشاد فرما رہے ہیں۔عرض کی "حضور کیا وجہ ہے کہ اسرار و رموز کو کوئی بھی واضح اور دو ٹوک انداز میں بیان نہیں کرتا بلکہ اشارے کنایوں میں بیان کرتے ہیں۔سمجھ آ گئے تو ٹھیک نہ آئے تو نہ سہی۔بہت سہارا لینا پڑتا ہے۔"

فرمایا "جی ہاں۔قدر و قیمت بھی تو اسی کی ہوتی ہے۔پھر بتایا کہ زیادہ صاف بات کریں تو لوگ بھاگ جاتے ہیں۔اب اگر ایک آدمی کی منزل ہی جنت ہے جب اس نے جنت دیکھ لی تو بھلا کیوں رکا رہے گا۔بھئی دیکھیں نا۔ایک آدمی کو ایک عورت سے شادی کرنا ہے۔وہ ایک پہاڑ پر رہتی ہے۔وہ اس کی خاطر روزانہ بلاناغہ پہاڑ کی چوٹی پر جاتا ہے۔جب شادی ہو جاتی ہے تو اب وہ پہاڑ کی چوٹی پر کیا لینے جائے گا۔اس کا جو مقصد تھا وہ تو پورا ہو گیا نا۔"

یہ بھی بتایا کہ "جب ذہن خیال میں معنی پہنانے سے قاصر ہو جاتا تو انسان

کومہ میں چلا جاتا ہے اور جب ذہن خیال وصول کرنے کے قابل نہیں رہتا تو یہ حالت موت کہلاتی ہے۔"

اطلاعات کو وصولی کی بات کرتے کرتے فرمایا۔"ایک بار میں اپنے پیرو مرشد حضور قلندر بابا اولیاؒ کے ہمراہ جارہا تھا۔وہ ایک پان کی دکان پر رکے۔پان خرید کر مڑے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں لگی ہوئی ایک تصویر مجسم ہو کر حضور قلندر بابا اولیاؒ کے ہمراہ چل رہی ہے اور کچھ باتیں کر رہی ہے۔حضورؒ اس کی باتیں سنتے رہے پھر وہ واپس پلٹ گئی۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھ کر حضورؒ سے دریافت کیا حضورؒ میں نے یہ دیکھا۔اس پر انہوں نے بتایا کہ وہ تصویر مجھ سے پان والے کی شکایت کر رہی تھی کہ یہ پان والا کتھے میں خون ملاتا ہے۔اس کے پان آپ کے کھانے کے نہیں اور دوسرے یہ کہ لوگ اس کو ہوسناک نظروں سے دیکھتے ہیں۔"

عرض کی پان والا کتھے میں خون کیوں ملاتا تھا؟ اس سے پان کا ایک ایسا ذائقہ بن جاتا ہے کہ وہ کسی اور چیز کا نہیں ہوتا اور آدمی اسی ذائقے کی خاطر اس مخصوص دکان سے پان خریدتا ہے۔"

حضور اٹھ کر باہر نکلے تو یکدم یوں لگا کہ باورچی خانہ خالی ہو گیا ہے۔آپ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ہم وہیں بیٹھے رہے۔میرے ذہن میں باورچی خانے

کے اس خالی پن کے احساس کے بارے میں تجسس ہو رہا تھا میں نے سوچا مگر دھیان بٹا ہی رہا۔ وہاں ایک صاحب چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے چہرے پر ایک عجیب سی مٹھاس اور اپنائیت۔ ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ وہ مظفر آباد سے آئے تھے۔ حکومت آزاد کشمیر میں ڈپٹی سیکرٹری تھے۔ حیرت سی ہوئی ان میں افسر شاہی کی خو بو نہ تھی۔ اس وقت تو ذہن میں یہی بات آئی کہ یہ صاحب بھی اپنی کسی پریشانی کے حل کے لئے ہی فقیر کے در پر آئے ہوں گے۔ مگر ان کی باتوں میں ان کے انداز میں یہ بات ضرور تھی کہ وہ مرشد کریم کی باتوں میں دلچسپی لے رہے تھے اور شاید یہی وہ قدر مشترک تھی جس کی بنا پر اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔

حاجی صاحب نے کہا کہ اب کھانا لگا دیا جائے۔ ہم باورچی خانے سے باہر آئے اب کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ اندر سے کسی کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ دروازے کے قریب ہوئے تو اندازہ ہوا کہ کوئی اونچی آواز سے پڑھ رہا ہے۔ جھانک کر دیکھا تو مرشد کریم تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں اور ایک بھائی روحانی ڈائجسٹ سے کوئی مضمون پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ مضمون کسی بکرے کے بارے میں تھا جس کو انسانی شعور مل جاتا ہے اور وہ انسانوں ہی کی طرح سوچتا ہے۔ مضمون سن کر مرشد کریم نے کہا ''بھئی اچھا لکھا ہے۔'' حاجی صاحب نیکھانے کی بابت اطلاع دی کہ دسترخوان پر انتظار

ہو رہا ہے۔ آپ اٹھ کر چل دیے۔ کمرے کی ایک کھڑکی سے مراقبہ ہال کا گیٹ اور باہر کا لان نظر آ رہا تھا اور ایک خوبصورت منظر سامنے تھا۔ ساتھ ہی ہال کمرے میں کھانے کے لئے دسترخوان بچھا ہوا تھا۔

کھانے کے دوران خاموشی ہی رہی۔ کھانے کے بعد حضور اٹھ کر ہاتھ دھونے چلے گئے۔ پھر آرام کرنے اپنے کمرے میں۔ ہم سب وہیں دراز ہو گئے۔ ذہن میں سرور اور خمار کے تاثر کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ آج مجھے پشاور سے نکلے کتنے دن ہو گئے۔ نہ تو بیوی بچوں کی یاد آ رہی ہے نہ ہی کاروبار کا خیال ستا رہا ہے۔ کوئی وسوسہ کوئی منفی خیال کچھ بھی تو نہیں۔ میں کیا ممتاز علی صاحب کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ مجھے یاد دلاتے بھی کہ آپ کا تو اپنا کاروبار ہے ہمارا تو ملازمت کا معاملہ ہے مگر ذہن میں کوئی خدشہ کوئی اندیشہ ابھرتا ہی نہیں تھا۔ ایک بار حضور مرشد کریم ہی نے فرمایا تھا کہ انہوں نے اپنے مرشد قلندر بابا اولیاءؒ سے اللہ والوں کی پہچان کی بابت سوال کیا تھا تو اس کے جواب میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے ان سے ارشاد فرمایا تھا ت۔ ''آپ پندرہ منٹ اس کے پاس بیٹھیں اگر ان پندرہ میں سے بارہ منٹ تک آپ کو دنیا کا خیال نہ ستائے، وسوسے اور پریشانی کا دھیان نہ آئے تو سمجھ لیں کہ وہ بندہ اللہ والا ہے ورنہ نہیں۔''

اس کو توضیح اور تشریح میں میرے مراد نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بندہ اتنا یکسو ہوتا ہے کہ جب آپ اس کے قریب جاتے ہیں تو آپ بھی یکسو ہو جاتے ہیں اور میں اس بات کو کچھ یوں سمجھا تھا کہ یکسوئی سے آپ کے اندر ایک مقناطیسی میدان پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کوئی دوسرا ذہن اس میدان میں داخل ہوتا ہے تو اسی مقناطیسی طاقت کے زیر اثر وہ بھی یکسو ہو جاتا ہے اور یہ یکسوئی کا ہی تو اعجاز ہے کہ بندے پر سکون کی بارش ہوتی ہے۔ کوئی وسوسہ، کوئی اندیشہ، کوئی پریشانی، کوئی انتشار، کوئی خلفشار اس بندے کو پریشان نہیں کر سکتا۔

شام کو عصر کے بعد دھوپ ڈھلنے پر لان میں نشست ہوئی۔ مرشد کریم نے گذشتہ روز ہی کی طرح مختلف لوگوں سے کتاب میں سے پڑھوایا۔ اس کے بعد بیگم سعیدہ ادریس صاحبہ سے عورتوں کے علاج معالجے اور انہیں مراقبہ کروانے کی بابت کہا۔ یہ اعزاز ان کو حاصل ہوا تھا کہ وہ وہاں پہ خواتین کے مراقبہ ہال کی انچارج بنیں۔ آج صبح ہی حاجی ادریس صاحب ہمیں ڈھلکیسولوجی کے حوالے سے علاج معالجے میں نئی تحقیقات کی روشنی

کے خلاف ہیں۔ نماز میں کوتاہی یا سستی پر کفر کا فتویٰ لگا دیتے ہیں۔ ان سے ان کی عمر دریافت کی اور جب انہوں نے بتایا کہ وہ پچاس سال کے ہو چکے ہیں تو یقین نہ آیا

میرے اندازے کے مطابق ان کی عمر چالیس سے کسی طور زیادہ نہ تھی۔ ان کی صحت مندی اور جوانی کا راز مراقبے کے علاوہ یوگا کی وہ ورزشیں بھی رہی تھیں جو وہ اپنی جوانی میں کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ جرمنی میں رہے۔ وہاں کتنا عرصہ گزار کر اس پہاڑ کو کاٹنے اس ملک میں آئے۔ اس پہاڑ سے ان کا اشارہ مراقبہ ہال والی پہاڑی کو کاٹنے کی طرف تھا۔ فرہاد کی طرح جوئے شیر لانے کو وہ کوئی اور پہاڑ کاٹ رہے تھے یا فقیری کے پہاڑ سے نبرد آزمائی کا کہہ رہے تھے یا ان کے پیشِ نظر کوئی اور پہاڑ تھا۔ میں نے وضاحت نہ چاہی کہ زندگی بھی تو ایک پہاڑ ہی کی مانند ہے۔ لوگ اس کی سیر کرنے آتے ہیں اور گزارنے والا اس کو کاٹ رہا ہوتا ہے۔

زیادہ تر لوگوں کے سوال نماز کی بابت تھے۔ ایک سوال یہ ہوا کہ نماز کے بعد مراقبہ کی کیا ضرورت۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا ''مراقبہ کا مطلب سوچ بچار۔ غور و فکر۔ کسی درخت کی بابت سوچنا بھی مراقبہ ہے۔ آپ نماز میں اللہ اکبر کہہ کر۔ خدا کی بڑائی مان کر آپ اللہ پر جتنا بھی غور و فکر کریں گے وہی مراقبہ ہے۔ نماز بھی درحقیقت مراقبہ ہی ہے۔ روزہ بھی

کے قریب ہو جائیں گے۔ جب کوئی آدمی مادی جسم کے خول سے بے نیاز ہو کر غور و فکر کرتا ہے تو اپنی روح سے واقف ہو جاتا ہے۔ روح کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ روح کو تلاش کرنا ہی

مراقبہ ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد مومن کو مرتبہ احسان حاصل ہوتا ہے، میں نمازی کے مراقبے ہی کی جانب اشارہ ہے۔ انہوں نے ہمیں اسی مراقبے کی کیفیت کی طرف متوجہ کیا ہے کہ وہ بندہ جو مومن ہوتا ہے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی موجودگی کی طرف متوجہ رہتا ہے۔''

پھر اس بات کی مزید وضاحت کو ایک پیر صاحب کا واقعہ سنایا۔ وہ اپنے ایک مرید پر زیادہ توجہ کرتے تھے۔ دوسروں کو رشک ہوا انہوں نے کچھ ایسی ویسی باتیں کہہ دی ہوں گی۔ پیر صاحب نے ایک روز ایک مرید کو بلایا اور قدرے رازداری سے ایک مرغی اور ایک چھری دے کر کہا اس کو ذبح کرنا ہے مگر ذرا دیکھ بھال کر۔ کہیں کوئی دیکھے نہ۔ وہ گئے اور ذبح کر کے لے آئے۔ پوچھا کسی نے دیکھا تو نہیں۔ اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا۔ اس نے کہا جی ہاں میں نے خوب اچھی طرح دیکھ بھال کر ذبح کی ہے۔ وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ خیر چند روز بعد دوسرے مرید کو بلایا اور اس سے وہی فرمائش کی کہ بھائی یہ مرغی ذبح کرنا ہے مگر کسی ایسی جگہ کرنا جہاں کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ ذرا چھپا کر احتیاط سے۔ وہ جی اچھا کہہ کر مرغی لے کر چلے گئے۔ صبح کے گئے دوپہر ہو گئی۔ وہ صاحب ندارد۔ پھر شام ہو گئی۔ سب باتیں بنانے لگے۔ اتنا سا کام کہا مرشد نے اور ان کا یہ حال۔

سلامت بغل میں۔ بھئی یہ کیا؟ تم نے اسے ذبح کیوں نہیں کیا، وہ مرید بولا۔ حضور آپ نے فرمایا تھا کہ اس کو کسی ایسی جگہ ذبح کرنا ہے جہاں کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ حضور میں نے تو جہاں بھی چھری اس کی گردن پر رکھی وہیں اللہ کو اپنی طرف دیکھتے پایا۔ حضور معافی چاہتا ہوں۔ میں اسے ذبح نہیں کر سکا۔"

وہاں بیٹھے افراد اس حکایت سے کیا سمجھے کیا نہیں مگر میں اتنا ضرور سمجھا کہ مرشد کریم ذہنوں کو کس کس طرح چمکاتے اور صاف کرتے ہیں تاکہ نظر کھلے اور بندہ وہ کچھ دیکھنے کے قابل ہو جائے جو اللہ اس کو دکھانا چاہتا ہے۔ مگر آدمی تو وہی کچھ دیکھتا ہے جو اس خود دیکھنا چاہتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا "اس طرح تو آدمی دنیا سے کٹ کر ہی رہ جائے گا۔"

فرمایا۔ "انسانوں نے خود کو دنیا میں پیسے جمع کرنے میں، مادی معاملات کو سیدھا کرنے میں ہی برباد کر لیا ہے۔ اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں۔ اللہ کے حقوق پورے کرنے سے پہلے حقوق العباد پورے کریں۔"

پھر کہا "فقیر کبھی نہیں بکے۔ فقیر کبھی بکتا ہی نہیں۔ ہمیشہ مولوی بکا حکمرانوں کے ہاتھوں۔ فقیر کبھی ایک دوسرے کی کاٹ نہیں کرتا۔ ہمیشہ مولوی کرتا ہے۔ اس کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ یہ کبھی کسی فقیر نے نہیں کہا۔ بریلوی دیوبندی کے پیچھے نماز نہیں

پڑھنا۔ یہ اہلِ حدیث ہے اس کی نماز اس کے پیچھے نہیں ہو سکتی۔ ویسے عجیب بات ہے مولوی ایک دوسرے کی نماز کو غلط کہتے ہیں ایک دوسرے کے پڑھائے ہوئے نکاح کو باطل قرار نہیں دیتے۔

ایک صاحب نے کتاب ''جنت کی سیر'' کے حوالے سے کوئی سوال کیا۔ فرمایا ''جی ہاں میں اس میں ایسی باتیں کہہ گیا ہوں جو کہنے کی نہیں تھیں۔ دراصل وہ کتاب میں نے اپنے مرشد کے جانے کے بعد لکھی۔ اُن کی زندگی میں ہوتی تو ایسی کھلی باتیں نہ ہوتیں۔ وہ اس کی اجازت بھی نہ دیتے۔''

فرمایا ''دولت پرستی بت پرستی ہے۔ شرک ہے۔ قومیں گناہوں کی وجہ سے نہیں شرک اور دولت پرستی کے سبب تباہ ہوتی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نہیں گناہوں پر پکڑ لیں تو اس طرح تو اس کے غفار الذنوب ہونے کی صفت زیرِ بحث آ جائے گی۔ دس ہزار سال لگتے ہیں قوموں میں دولت پرستی آنے میں اور جب دولت پرستی آ جاتی ہے تو قومیں تباہ کر دی جاتی ہیں۔''

دریافت کیا ''دولت پرستی سے کیوں کر بچا جائے۔ اس کو چھوڑا کیسے جائے؟''
اس پر ارشاد فرمایا۔ ''آپ اللہ پرستی شروع کر دیں باقی سب پرستیاں خود ہی چھوٹ جائیں گی۔''

پھر ایک صاحب کا واقعہ سنایا۔ یہ صاحب کسی پیچیدہ مرض میں مبتلا ہو کر علاج کے لئے آپ کے پاس آئے تھے۔ فرمایا ''میں نے ان کا علاج کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ اصل قصہ کیا ہے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ مرض آپ کو کیوں ہوا۔ اس پر انہوں نے بتایا میری بیماری کی اصل وجہ میرا گناہ ہے۔ میں نے ان سے پوچھا آخر ہو کیا۔ پہلے تو انہوں نے ٹالا مگر پھر بتایا کہ وہ سعودی عرب میں کام کرتے تھے اور اس ادارے میں ملازم تھے جو غلاف کعبہ تیار کرنے کا ذمہ دار ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ غلاف کعبہ میں استعمال ہونے والے سونے کی چوری کرتے تھے اور انہوں نے تو لے نہیں کلو کے حساب سے سونا چوری کیا۔ اس کی تفصیل انہوں نے یہ بتائی کہ وہاں سونا تاروں کی شکل میں آتا تھا اور بنائی میں استعمال ہوتا تھا۔ وہ اس سونے کے تار نگل لیا کرتے اور بعد میں فضلہ خشک کر کے اس کو جلا کر اس میں سونا حاصل کر لیا کرتے تھے۔ فرمایا ''انہوں نے بھی کیا طریقہ سوچا۔''

نماز مغرب کے لئے اٹھے تو یہ نشست اپنے اختتام کو پہنچی۔ رات کھانے کے بعد سیر کے لئے نکل گئے چاندنی رات کچھ عجیب طرح سے روشن لگ رہی تھی۔ رات کے وقت اتنی دور تک منظر کم ہی اتنا کھلا اور روشن دیکھا ہے۔ ذہن میں مرشد کریم سے سنی ہوئی باتوں کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ رات کو سونے کے لئے مراقبہ ہال کی چھت پر

انتظام کیا گیا تھا۔ چھت پر لیٹ کر چاند کو بادلوں کے بیچ تیرتے دیکھتے دیکھتے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ہوا تیز ہو گئی۔ بادل گہرے ہو گئے بارش کے آثار دیکھ کر حاجی صاحب نے طے کیا کہ ہم نیچے کمرے میں ہی سوئیں چنانچہ کھلی فضاؤں کو خیر باد کہہ کر نیچے اتر آئے۔

صبح جب کمرے سے باہر آئے تو فضا کچھ دھلی دھلی سی تھی۔ رات بارش ہوئی تھی مگر بات بوندا باندی تک ہی رہی ہوگی کیونکہ حاجی صاحب کہہ رہے تھے کہ اتنی بارش سے تو سڑک پر چھڑکاؤ بھی نہیں ہوتا۔

آج کا پروگرام پکنک پر جانے کا تھا۔ ابھی ناشتہ سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ پتہ چلا کہ اقبال قریشی صاحب، سمیع اللہ اور شیر محمد صاحب کے ہمراہ پشاور سے آئے ہیں۔ سب سے ملنے ملانے کے بعد وہ مرشد کریم سے ملے۔ مرشک کو دیکھ کر ان کے دلوں کی دھڑکنوں کا کیا عالم ہوا ہوگا یہ تو وہی جانتے ہوں گے مگر میں ان کے لرزتے ہونٹوں سے ان کے اندر ہونے والی کھد بد کا اندازہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ پشاور سے ساری رات کا سفر کر کے صرف اپنے مرشد کریم دیدار کرنے کا کڑوا گھونٹ آئے تھے۔ ایسی کیفیت عشق کے اولین دور کی بیتابیوں کی عکاس ہوا کرتی ہے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ

ہم سب پکنک پر جا رہے ہیں اور وہ بھی ہمارے ساتھ جائیں گے تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔

ایک بار مرشد کریم نے ایک خط میں منصور الحسن صاحب کو لکھا تھا ''محبت، عشق اور عقیدت تین رخ ہیں جو ہر انسان کے اندر رواں دواں رہتے ہیں۔ کبھی یہ رخ تالاب کی صورت میں ہوتے ہیں کبھی ندی نالوں آبشاروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور کبھی سمندر بن جاتے ہیں اور جب یہ رخ سمندر بنتے ہیں تو بندہ عشق سے گزر کر عقیدت کے دائرے میں آ جاتا ہے۔''

اس بات کو پڑھنے سے پہلے تک میرے ذہن میں یہ ترتیب عقیدت محبت اور عشق تھی۔ یعنی میں سمجھتا تھا کہ کشش کے تحت عقیدت پیدا ہو کر محبت میں ڈھل جاتی ہے اور محبت رفتہ رفتہ بڑھ کر عشق کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جس روز میں نے منصور بھائی کے نام خط میں یہ بات پڑھی میرے ذہن میں کئی فلسفے تلپٹ ہو گئے۔ کئی نئی باتیں روشن ہو گئیں۔ کسی بات کا صحیح ادراک ہو جائے تو یوں جانیے کہ عطائے نعمت ہو گئی۔ انعام نصیب ہو گیا۔ سارا کھیل ہی الٹا کی ترتیب کا ہے۔ یہ ترتیب بگڑ جائے تو بندہ راندۂ درگاہ اور بھٹکا ہوا کہلاتا ہے اور اگر یہ ترتیب سنور جائے تو بندہ بندہ بن جاتا ہے۔ ترتیب میں حسن اور توازن آ جائے تو بندہ نکھر جاتا ہے۔

پکنک کے لئے قافلہ تیار ہوا۔ چار پانچ گاڑیوں میں سے مجھے اور ممتاز بھائی کو اسی گاڑی میں جگہ دی گئی جس میں مرشد کریم تشریف فرما تھے۔ میں نے احساسِ تشکر اور ممنونیت سے حاجی صاحب کو دیکھا اور ان کا شکریہ ادا کیا انہوں نے کمالِ شفقت سے میرا ہاتھ دبایا اور کہا۔ ''مرشد کریم ایسا ہی چاہتے ہوں گے۔ تبھی ایسا ہوا ورنہ ایسا نہ ہوتا۔'' میرے مراد نے ایسا چاہا اس لئے ایسا ہو رہا ہے۔ میرے روئیں روئیں سے کرنٹ گزر گیا۔ یا اللہ تیرا شکر کہ تو نے مجھے اس بندے کی نسبت عطا فرما دی جس کی خوشنودی کے لئے کام کرنا مجھ ایسے اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ میرے مراد نے اپنی بے پایاں شفقت کا ایک بار مزید اظہار کرتے ہوئے مجھے اپنے قرب سے سرفراز کیا تھا۔

گاڑی میں بیٹھنے لگے تو حاجی صاحب نے جادو ٹونے کی بابت کچھ دریافت کیا اس پر فرمایا۔ ''ہمیں اللہ پر یقین ہو تو کوئی جادو اثر نہیں کر سکتا۔ یہ سب زبانی جمع خرچ ہے۔ جادو کرنے والا سو پچاس روپے لے کر آپ کے لئے جادو کرے تو بھلا وہ اپنے لئے ایک آدھ لوٹ کیوں نہیں چھاپ لیتا۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ جو کوئی جادو ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو صرف اس صورت میں جب کوئی واقعی جادوگر ہو اور پھر جادو کا کوئی ٹیسٹ بھی تو نہیں کہ واقعی جادو ہوا بھی یا نہیں۔ پہلے عورتیں جادو کا شکار ہوا کرتی تھیں اور آج کل ہمارے یہاں مرد زیادہ آتے ہیں جی ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔''

پھر فرمایا۔''اللہ انسان کی مرمت اور دیکھ بھال پر 92 لاکھ روپے یعنی تقریباً ایک کروڑ روپے روزانہ خرچ کاتا ہے۔ جو اللہ آپ پر ایک کروڑ روپے روزانہ خرچ کرتا ہے اس سے دو چار ہزار روپے کی نوکری مانگنا کہاں کا انصاف ہے۔''

حاجی صاحب نے کسی صاحب کی تعریف کی تو اس پر فرمایا'' حضور قلندر بابا اولیاؒ نے بھی مجھے کیسے کیسے بندے سیلکٹ کر کے دیئے ہیں۔'' میں نے اس سلیکشن کی وضاحت چاہی تو فرمایا ''سلیکشن تو اوپر سے ہی ہوتا ہے۔ جب سلیکشن ہو جاتا ہے تو پھر بندے میں ویسی ہی صلاحیتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں جس کام کے لئے اس کا سلیکشن ہوا ہوتا ہے۔''

کاکڑ ٹاؤن سے نکل کر گاڑی پہاڑی راستوں پر بار بار مڑتی تو جھولے کا سا تاثر ابھرتا۔ میں جھولے جھولتا باہر دیکھ رہا تھا۔ مجھے بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ سڑک یہ راستے میرے لئے اجنبی نہیں۔ میں ان سے مانوس ہوں۔ اتنے میں میرے مراد نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا'' آپ کو تو کوہاٹ یاد آ رہا ہوگا۔'' اس بات کی خوبصورتی کا احساس تب ہوگا جب آپ کو یہ معلوم ہو کہ مرید کا سسرال کوہاٹ ہے اور پشاور سے کوہاٹ جانے کا راستہ درہ آدم خیل کے بعد ایک پہاڑی درے سے ہو کر گزرتا ہے اور مجھے یہ جگہ اسی لئے مانوس لگ رہی تھی کہ یہ راستہ کوہاٹ کے اس راستے سے مشابہت رکھتا

تھا۔ وہی چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے ڈھکی پہاڑیاں ۔ ویسے ہی پتھریلے پہاڑ۔

میں نے ''جی ہاں'' کہہ کر بات کی لطافت کو محسوس کرتے ہوئے ممتاز علی صاحب کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہے تھے۔

میں نے دوبارہ باہر نظر دوڑائی ۔گاڑی موڑ کاٹ رہی تھی اور ایسے زاویے پر تھی جہاں سے ہمارے پیچھے آنے والی گاڑیاں چھوٹی چھوٹی کھلونا گاڑیوں کی طرح نظر آ رہی تھیں ۔ہم بلندی پر تھے انہوں نے ابھی وہاں پہنچنا تھا جہاں ہم اپنے مراد کے ہمراہ تھے ۔ میں نے پورے منظر کو دیکھا کالی سڑک، بھورے پہاڑ، سرمئی پتھر، سبز جھاڑیاں، زرد پتے، سفید گاڑیاں نیلا آسمان ۔ پوری وادی میں سرخ رنگ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری نگاہیں سرخی کی تلاش میں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر پھر گئیں۔ ابھی میں اسی مخمصے میں تھا کہ میرے مراد کی آواز نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی ۔ میں نے آواز تو سنی مگر سمجھا کچھ نہیں ۔ میں نے سوالیہ نظروں سے حاجی صاحب اور ممتاز علی کی طرف دیکھا ۔حاجی صاحب نے جملہ دہرایا ''آپ کہہ رہے ہیں کہ مقصود صاحب تو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہیں ۔'' آپ نے جملہ مکمل کیا'' کہ یہ کوہاٹ سے کس قدر مختلف ہے۔''

میرا سر ندامت سے جھک گیا ۔میرے مراد نے میرے انداز نظر پر کس قدر کڑی پکڑ فرمائی تھی کہ میں تنقیدی انداز نظر رکھتا ہوں یعنی جو حاصل ہے ۔اس پر شکر نہیں

اور جو سامنے نہیں اس کا شکوہ ۔ مجھے خیال ہوا کہ میں شکر میں کوتاہی اور جو حاصل نہیں، اس پر شکوے کا مجرم ہوں، لیکن مراد کی شفقت کہ'' کو ہاٹ سے کس قدر مختلف ہے کی اضافت لگا کر میرے جرم پر پردہ ڈال دیا، میں نے دل ہی دل میں اپنی بہت سی نعمتوں کے یکجا ہونے پر شکر کیا اور توبہ کے الفاظ تراشنے لگ گیا، اتنے میں گاڑی نے موڑ کاٹا، بالکل میرے سامنے ایک درخت تھا۔ اس درخت کے پتے ہی نہیں ٹہنیاں تک سرخ تھیں ۔ وہ دور سے بھی اتنا نمایاں اور اتنا واضح تھا کہ اس کو نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

حاجی ادریس صاحب نے مرشد کریم کے کسی استفسار پر کہا ''شوکت مجید صاحب جوڈپٹی سیکرٹری ہیں وہ ساہی میں پکنک کے لئے ڈاک بنگلہ لے کر دینا چاہ رہے تھے، لیکن ہم نے سوچا کہ کھلی فضا میں ہی پکنک منائیں گے۔'' اس پر مرشد کریم نے فرمایا ''مراقبہ ہال بھی تو سرکاری ڈاک بنگلے ہی ہیں اور ان کے انچارج کسی ڈی سی سے کم نہیں ۔'' مجھے سوجھا اور میں نے کہہ دیا،'' ان کو اپنے کورز کے آنے پر خوب بھاگ دوڑ کرنا ہوتی ہے۔''

میرے مراد نے حاجی صاحب کو مخاطب کر کے کہا'' حاجی صاحب یہ کورز خود کو کہہ رہے ہیں ۔'' اب میرے ذہن میں کورز میرے مراد کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا،

لیکن انہوں نے کس قدر خوبصورتی سے اس قسم کے عہدوں سے فقیر کو محفوظ و مامون کرنے کی تلقین فرمائی۔

ہماری گاڑی کچھ تیز تھی، یا پچھلی گاڑیاں آہستہ بہر حال ہم چوکی پہنچے تو حاجی صاحب نے ڈرائیور سے وہاں رک جانے کو کہا تا کہ پچھلی گاڑیاں وہاں پہنچ جائیں۔ دراصل وہاں سے سڑک کے دو راستے ہو رہے تھے، اور ایسا نہ ہو کہ پیچھے آنے والے یہ تعین نہ کر سکیں کہ ہم کس راستے پر چلے گئے ہیں اور انہیں کوئی پریشانی ہو۔ ہم بھی ٹانگیں سیدھی کرنے کو نیچے اتر آئے۔ یہاں سبزہ قدرے گہرا تھا، درخت بھی لمبے لمبے تھے۔ چھاؤں کا تاثر بہت سہانا لگا، میرے مراد نے حاجی صاحب سے کہا۔ ''کسی ایسی جگہ چلیں، جہاں چشمہ ہو۔'' حاجی صاحب نے سوا کہا لپوٹہ کہ وہاں چشمہ ہوگا۔ میں اور ممتاز علی بچوں کی طرح کبھی ادھر جاتے کبھی ادھر، یوں لگتا تھا کہ ابھی باپ کی آواز آئے گی، ادھر مت جاؤ گر جاؤ گے، میں اس آواز کے آنے سے پہلے پلٹ آیا۔

مرشد کریم وہاں بنے ہوئے، ایک کٹیا نما کمرے کو دیکھ رہے تھے۔ وہاں کوئلے سے دیواروں پر مختلف نام لکھے ہوئے تھے۔ ممتاز علی وہ نام پڑھ رہے تھے۔ میں مرشد کریم کے قریب کھڑا تھا۔ جس درخت کے نیچے حضور کھڑے تھے، اس پر سیاہ رنگ کے توت لگے ہوئے تھے، میں نے چند ایک توت توڑے اور ہتھیلی پر رکھ کر اپنے مراد کے

حضور پیش کیے۔ انہوں نے ایک دانہ اٹھا کر کھایا اور باقی مجھے خود کھانے کو کہا۔ میں نے جونہی یہ توت منہ میں ڈالے مجھے ایک سوال سوجھا، میں نے عرض کی، ''کسی صنعت کو دیکھ کر ہم صانع کو کیونکر پہچان سکتے ہیں یعنی صنعت کو دیکھ کر ہمیں زیادہ سے زیادہ صانع کی کاریگری کا اندازہ ہی ہوگا یہ اس کی پہچان تو نہ ہوئی۔''

اس سوال کے جواب میں مرشد کریم نے کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کی۔ فرمایا ''اپنی پہچان کا طریقہ ہی تو بتانے کے لئے پیغمبر بھیجے گئے۔ پیغمبروں نے کہا مخلوق کا خالق سے رشتہ استوار ہونا چاہیے۔ تمام پیغمبروں نے اس بات کا بھی اقرار کیا کہ اللہ کا محبوبؐ آئے گا، جو اس بات کو واشگاف کر دے گا، کہ اللہ کو کیسے پہچانا جائے۔ معراج پر حضورؐ نے جو کچھ دیکھا۔ خود اللہ نے کہا غلط نہیں دیکھا۔ ہم ایسے نصیب والے ہیں کہ ہمارے سر پر اس بندے کا ہاتھ ہے۔ جس کے ساتھ اللہ نے راز و نیاز کیے۔''

میرے مراد کو موتی بکھیرتے سن کر ممتاز علی بھی قریب آ گئے۔ حضور نے اپنے ایک دوست کا واقعہ سنایا کہ کس طرح انہوں نے اصرار کر کے انہیں خود پر تصرف کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اور جب وہ تصرف کرنے بیٹھے تو حضور قلندر بابا اولیاؒ نے انہیں منع کر دیا۔'' اس لئے کہ اگر کوئی آدمی شہد لینے جائے تو اسے پہلے برتن کو تیار کرنا چاہیے۔ برتن کے بغیر وہ شہد کو رکھے گا کہاں۔ پھر فرمایا۔۔۔ ''خود دلچسپی لئے بغیر محض دعا نظر اور عطا کے

چکر میں نہیں رہنا چاہیے، خود کو تیار کرنے میں دلچسپی لیں۔''

بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ حاجی صاحب نے اطلاع دی کہ گاڑیاں پہنچ گئی ہیں، ہم دوبارہ گاڑی میں بیٹھے۔ میں ابھی ابھی ہونے والی گفتگو کے معنی اور مفاہیم کو اپنی یادداشت میں محفوظ کرنے میں لگا ہوا تھا، گاڑی ایک گلی بندھی رفتار سے ہمیں جھولا جھلاتی چلی جارہی تھی۔ میرے نظروں کے سامنے سے درخت گزر رہے تھے۔ چھوٹے بڑے سبھی طرح کے درخت، ہوا بند تھی، درختوں کے پتے ساکن اور اداس سے لگے۔ میں نے دوبارہ دیکھا۔ پتے خشک سالی کے ہاتھوں مرجھائے ہوئے سے لگے۔ میرے جی میں آیا میں اپنے مراد سے پوچھوں کہ ان درختوں کو اگر پانی نہ ملا، اور یہ مرگئے، تو کیا ہو گا۔ میں نے اگلی سیٹ پر بیٹھے مراد کی طرف نظر کی وہ گاڑی کے جھولتے پر سو رہے تھے۔ گردن ایک کندھے کی طرف ڈھلکی دیکھ کر میں خاموش ہی رہا۔ اور درختوں کو خاموش اور ساکن کھڑے دیکھتا رہا، میرے اندر ایک آواز سی گونجی۔ یہ درخت موت کو سامنے دیکھ کر بھی پریشان نہیں ہوتے۔ چپ چاپ خود کو مرنے دیتے ہیں، پانی ملے یا نہ ملے، یہ دلوں طرح خوش ہیں، درخت تو درخت، ہر جانور، وہ پرندے ہوں، چرندے ہوں، یا درندے ہوں، جب انہیں پتہ چل جائے کہ ان کا وقت ختم ہوگیا ہے تو وہ خاموشی سے اپنی جاں جانِ آفریں کے سپرد کردیتے ہیں، انہیں زندہ رہنے کا اتنا لپکا نہیں ہوتا جتنا انسانوں

کو ہے۔ یہ انسان ہی ہے جو مرنے سے بچنے کی آرزو میں موت کو ہی بھلا دیتا ہے،''

ہمیں ان درختوں کی مانند استقلال سے ہونے والی بات کا انتظار کرنا سیکھنا چاہیے۔''

میں نے انتہائی رسانیت سے سوچا کہ اب ہم انسان ہو کر مرنا بھی درختوں سے ہی سیکھیں گے تو ہمارا شرف کہاں گیا؟ اسی آواز میں جواب ملا۔ ''مرنا بھلا کر کیا تم نے شرف کھو نہیں دیا۔'' بے شک ہم نے مرنے سے پہلو تہی کی تبھی تو ہمارے ہادی، ہمارے نبیؐ، ہمارے آقا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے موتو قبل انتم موتا؟ مر جاؤ مرنے سے پہلے، کہہ کر ہماری توجہ اس قانون کی طرف مبذول کروائی تھی، کہ اگر تم مرنا سیکھ رکھو گے تو تمہارا شرف تمہارا رہے گا ورنہ تم تو ان درختوں سے بھی گئے گذرے ہو۔ میں نے خود کو مرنے پر آمادہ کرنے کی بابت سوچا۔ بہت سوچا۔ مگر خود کو بہلاوہ دیتا رہا، جب موت آئے گی تو مرنا تو ہے ہی۔ اس سے پہلے تو میں چاہوں بھی تو مر نہیں سکتا۔ میں نے اپنے مراد کی طرف دیکھا۔ وہ راستے میں آنے والی ایک برساتی ندی میں رینگتے ہوئے پانی کو دیکھ رہے تھے، ایک دو عورتیں پانی سے اپنے گھڑے بھر رہی تھیں۔

ایک گاڑی ہم سے آگے نکل گئی۔ وہ راستے میں آنے والے ایک قصبے میں کھڑی تھی۔ ہم بھی رکے۔ وہاں اتر کر ادھر ادھر گھومے ایک دو دکانوں میں گئے، اقبال قریشی صاحب نے بوتلیں اور بسکٹ خریدے۔ ممتاز علی صاحب نے چیونگم خریدا اور سب

کو ایک ایک چیونگم دی۔ اس گاؤں کا نام شاید لپا تھا۔

وہاں سے بیر گلی تک راستہ میدانی سا تھا۔ ہم اتنا سفر کر کے کچھ تھکن سی محسوس کرنے لگے تھے اتنے میں ایک گھر پر نظر پڑی۔ عجیب زرق برق رنگوں میں سجا ہوا گھر تھا۔ دور سے نظر میں آ جاتا تھا۔ لگتا تھا بنانے والے نے خوب دل لگا کر بہت سا مال خرچ کر کے دنیا بھر کے رنگ اس پہ انڈیل دیئے تھے۔ ہم سبھی اس گھر کو دیکھ رہے تھے۔ اس ویرانے میں سڑک سے ڈیڑھ دو سو گز دور یہ گھر واقعی کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

مرشد کریم نے اس پر تبصرہ کیا، ”جنگل میں مور نا چا کس نے دیکھا“۔

سانبی تک راستے میں کوئی خاص بات کوئی خاص واقعہ نہ ہوا۔ چند ایک عورتیں نظر آ ئیں، وہ دور سے نظر آ رہی تھیں، اتنی ہی دور ایک دو آدمی بھی کھڑے، مگر وہ اتنے واضح نظر نہیں آ رہے تھے، میں نے اندازہ کرنے کی کوشش کی کہ ان عورتوں کو میں نے پہلے کیوں دیکھا اور یہ آدمی مجھے پہلے کیوں نظر نہیں آئے۔ مجھے کہیں پڑھی ہوئی بات یاد آئی کہ عورت سرخ لباس اس لئے پہنتی ہے کہ یہ رنگ دور تک نظر آتا ہے۔ شاید یہ بات ممتاز مفتی کے کسی افسانے یا تحریر کردہ مضمون میں پڑھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ واقعی عورتوں کے لباس کے رنگ میں سرخی کا عنصر نمایاں تھا اور مردوں کے لباس یا تو خاکی رنگ کے تھے اور یا پھر خالے سے ملتے جلتے۔ سفید بھی کم ہی تھے۔ میں باقی راستے میں

دور دور تک یہی دیکھتا رہا، کبھی مجھے مل فائٹنگ میں سرخ رنگ کے رومال کا خیال آتا اور کبھی دلہن کے سرخ جوڑے کا۔ سہانی سے گزر کر ہم مبز بیر پہنچ گئے۔ وہاں فوجی کھڑے تھے۔ حاجی صاحب نے کہا اس سے آگے جانا مناسب نہیں ہوگا ہم یہیں پکنک منا لیتے ہیں۔ مرشد کریم نے فرمایا۔ کسی چشمے کے پاس ہو تو بہتر رہے گا، انہوں نے کہا جی ہاں وہ رہا پانی کا چشمہ ہم سب نے ادھر ادھر دیکھا۔ ہمیں کہیں کوئی چشمہ نظر نہیں آیا۔ سڑک کے بائیں طرف ایک چھوٹی سی نالی البتہ دیکھی۔ سڑک آگے جا کر مڑتی اور اس نالی نما ندی گزرتی ہوئی پاڑی پر چڑھ کر دوسری طرف غائب ہوتی نظر آ رہی تھی۔ ممتاز علی صاحب نے ندی کی طرف اشارہ کر کے دریافت کیا یہ ہے چشمہ؟ اقبال قریشی اور فاروق بیگ صاحب نے ترحم آمیز نظروں سے ممتاز علی کی طرف دیکھا کہ انہیں ندی اور چشمے کا بھی فرق معلوم نہیں۔ حاجی صاحب نے سڑک کے کنارے ندی کے مخالف سمت والی طرف بنی ہوئی اینٹوں کی ایک کھوہی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ ہے چشمہ! ہم نے ایسا چشمہ بھلا کہاں دیکھا تھا، اسی چشمے سے وہ پانی رس رہا تھا جو ندی میں جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جس زمانے میں سڑک کی تعمیر ہوئی تھی سڑک بنانے والے مزدوروں نے اپنے پینے کے لئے اس کاریز نما چشمے کے گرد پتھر چن کر اس کے پانی کو روکا اور اس کو پتوں اور حشرات سے محفوظ کرنے کو اس کے اوپر ایک چبوترہ سا بنا دیا تھا۔

اس چشمے سے چلو بھر کر پانی پیا حالانکہ وہاں ایک کٹورہ نما پیالہ بھی پڑا تھا۔
پھر ہم اوپر پہاڑ پر چڑھ کر سڑک سے سو ڈیڑھ سو گز دور چلے گئے۔ حضور کے لئے ایک
چادر بچھا دی گئی۔ وہاں سے سڑک کا منظر نظر آ رہا تھا۔ ایک بورڈ پر نظر پڑی۔
M T U سب سے پوچھا، کسی نے بتایا۔ بعد میں وہاں ایک فوجی آ گیا۔ ہمیں کھانا
پکاتے دیکھ کر تحقیق احوال کے لئے آیا ہوگا۔ پہلے تو اس نے ہمیں وہاں سے ہٹنے کو کہا مگر
جب فاروق بیگ اور دیگر ساتھیوں نے وہاں کے لوکل لوگوں کے نام لئے تو وہ مرعوب
ہو کر کہنے لگا میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائیں۔ میں نے اس سے پوچھا یہ
M T U کیا ہے، کہنے لگا، میول ٹریننگ یونٹ۔ یعنی یہاں خچروں کو تربیت دی جاتی
ہے، ان پہاڑوں پر سامان، اسلحہ اور گولہ بارود کی نقل و حرکت، انہیں خچروں کے ذریعے
ہوتی ہے۔

ہم وہاں بیٹھے کھانے کا انتظام ہوتے دیکھ رہے تھے۔ جنگل میں منگل کا
سماں ہو رہا تھا۔ مرغیاں دھل رہی ہیں۔ آگ جلائی جا رہی ہے۔ چٹنی بنائی جا رہی ہے۔
کوئی پانی کے لئے نیچے اسی چشمہ نما سے پانی بھر کر لا رہا ہے۔ اتنے میں خچروں کی ایک ٹولی
وہاں سے گزر رہی، سب کے سب خچر ایک جیسے سرمئی رنگ کے قد کاٹھ میں بھی ایک
جیسے۔ دوسری ٹولی بھورے رنگ کے خچروں کی گزر رہی۔ کچھ دیر بعد وہاں سے چتکبرے

خچروں کی ایک ٹکری گزری۔ ہر ٹکری میں بیس بائیس خچر تھے۔

میں نے دیکھا کہ میرا مراد ادھر ادھر گھوم کر پچھلی دری پر آکر بیٹھ گیا ہے تو میں نے قریب جا کر راستے میں سوچی گئی بات کی تصدیق کے لئے پوچھا کہ حضور یہ عورتیں سرخ رنگ کا لباس کیوں پہنتی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ حضور وہی بات کہیں گے کہ دور سے نظر آنے کو۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے فرمایا ''عورت کی تخلیق کچھ اس طرح کی ہے کہ اس کو سردی زیادہ لگتی ہے اور اس سردی کے احساس کا مقابلہ وہ سرخ رنگ کے استعمال سے کرتی ہے۔ سرخ رنگ گرم ہوتا ہے۔''

اب میرے ذہن میں مغرب کی وہ عورتیں بھی تھیں، جن کے بدن پر لباس کی مقدار نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے اور وہیں سب سے زیادہ سردی پڑتی ہے، اور اگر عورتوں کو سردی زیادہ لگتی ہے، تو ان لباس ادھورا اور مردوں کا پورا کیوں ہاتا ہے، میں اس پر سوال پوچھنے کو الفاظ منتخب کر ہی رہا تھا، کہ مرشد کریم نے ارشاد فرمایا، مغرب میں عورت کو مردوں نے بے وقوف بنایا ہے، اس لئے وہ ٹھٹھرتی بھی ہے اور لباس بھی پورا نہیں پہنتی۔''

چیڑھ کے بلند و بالا درختوں کو دیکھ کر پوچھا ان کی عمر کیا ہوگی، ہم کچھ اندازہ نہ کر سکے، اس پر فرمایا، ''آپ اندازہ کریں یا کسی سے پوچھیں۔'' پھر فرمایا۔'' یہاں جس

ہے، اس کی وجہ آکسیجن کی زیادتی ہے۔ جب آکسیجن زیادہ ہو جاتی ہے، تو گرمی آ جاتی ہے، اور جب آکسیجن کم ہو جاتی ہے، تو موسم سرد ہو جاتا ہے۔"

پھر کہا" اب آپ جا کر ادھر ادھر گھومیں پھریں اور دیکھیں۔ آپ مجھ سے تو ملتے ہی رہتے ہیں، جا کر ادھر ادھر ان درختوں اور پودوں سے بھی ملیں" ہم سمجھ گئے کہ اب حضور اکیلے بیٹھنا چاہ رہے ہیں۔ ہم ادھر ادھر ہو کر اوپر پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ اوپر جا کر ایک پتھر پر کھڑے ہو کر میں نے نیچے دیکھا۔ مجھے ڈر سا لگا۔ یوں لگا، جیسے میں نیچے گر جاؤں گا۔ کوئی چیز مجھے نیچے کھینچ رہی ہے، یا کوئی طاقت مجھے آگے دھکیل کر نیچے گرا دے گی۔ بمشکل نیچے اتر کر موقع کی تلاش میں رہا کہ اس کی توجیح دریافت کروں، مگر جو کچھ انہوں نے فرمایا اب وہ پوری طرح تو یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ احساس کے حوالے سے کچھ فرمایا تھا کہ یہ دیکھنے والے کا اپنا احساس ہے کہ کہیں اس کا وزن اس کو نیچے نہ دھکیل دے۔

ایک دو آدمی سڑک کے دوسری طرف پہاڑی پر گئے اور جب واپس آئے تو کسی گھر سے مانگی ہوئی لسی کی بھری ہوئی بالٹی اٹھائے ہوئے تھے۔ کھانے کے ساتھ اس لسی نے خوب لطف دیا۔ کھانے کے بعد چائے کا پروگرام بنا، چائے پی کر واپس روانگی ہوئی۔

واپسی میں راستے میں ایک گاڑی ہم سے آگے جا رہی تھی۔ اس پر ویڈیو فلم بنانے والے ایک بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہماری گاڑی کی ویڈیو فلم بنا رہے تھے۔ حضور نے ان کو پیغام دلوایا کہ اردگرد کے مناظر اور سینری کو فلم بند کریں۔ اس وقت تک وہ احتراماً گاڑی کے اندر بیٹھ کر فلم بندی کر رہے تھے۔ حضور کی طرف سے اشارہ ملنے پر وہ گاڑی کی چھت پر بیٹھ گئے اور کیمرے کی آنکھ سے اس سفر کو دیکھتے رہے۔

ایک مسجد کے پاس گاڑی رکوا کر حضور نے وضو تازہ فرمایا۔ قصر نماز عصر ادا کی۔ مسجد میں خوب دبیز قالین بچھے دیکھ کر تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ جتنی دیر حضور نماز ادا کرتے رہے، ایک بھائی قالین پر لیٹے، مرشد کریم کو نماز ادا کرتے دیکھتے رہے۔ پوچھا کہ آپ نے نماز کیوں نہیں پڑھی، اگر نہیں پڑھنا تھی تو مسجد میں آئے ہی کیوں؟ کہا۔ '' مسجد تو میں مرشد کی تقلید میں آ گیا۔ میرے کپڑوں نے مجھے نماز کی ادائیگی سے روک دیا۔ دراصل میرے کپڑے صاف نہیں، یہ کہہ کر وہ جس شرارت سے مسکرائے مجھے یوں لگا، انھوں نے نظام نماز پر طنز کیا ہو۔

مسجد سے نکل کر گاڑی میں بیٹھے تو ممتاز علی صاحب نے مسجد پر لگے ایک بورڈ کی جانب متوجہ کیا۔ اس پر کسی مسلک کا نام لکھا ہوا تھا کہ اس مسجد میں فلاں نظام فقہ کے مطابق نماز ہوتی ہے اور قرآن کی تعلیمات بھی اسی مسلک کے مطابق دی جاتی ہیں۔ بورڈ

کی عبارت کی طرف توجہ دلانے کا مقصد یہی رہا ہوگا کہ اس قسم کی چھوٹی موٹی ہر بات پر بھی مرشد کریم کی رائے لے لی جائے ۔ خانقاہی نظام تعلیم میں مراد اپنے مریدین کو اپنا ذہنا اپنی طرز فکر منتقل کرتا ہے۔ اس ذہن اور طرز فکر کی منتقلی سے بنیادی طور پر مرید کے اندر سوچ بچار اور غور و فکر کا ایک ایسا انداز راسخ کرنا مقصود رہتا ہے جو انبیاء کی طرز فکر سے مطابقت رکھتا ہو۔ اب انبیاء اس طرح کی طرز فکر کے بارے میں بتانا کہ درحقیقت انبیاء کی طرز فکر ایسی تھی، ظاہر ہے کسی بہت ہی عالم و فاضل بندے کا کام ہے ۔ لیکن یہ سکھانا کہ انبیاء اس طرح ان طرزوں سے سوچتے تھے اور آپ اپنی طرز فکر کو ان کی طرز فکر سے اس طریقے سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں، ظاہری بات ہے کہ یہ کام محض عالم اور فاضل ہونے سے نہیں ہو سکتا ۔ بلکہ اس کے لئے سکھانے کے آداب سے واقفیت کی حامل شخصیت بھی درکار ہوتی ہے ۔ اور پھر اس وقت کیسی شخصیت درکار ہوگی جب بات منتقلی ذہن تک آ جائے ۔ سیدھی سی بات ہے کہ یہ کام وہی بندہ کر سکتا ہے جس کو یہ معلوم ہو کہ انبیاء کرام طرز فکر کیا تھا اور نہ صرف یہ کہ معلوم ہو بلکہ خود اس کا ذہن ان کی طرز فکر کے مطابق ڈھلا ہوا، ترشا ہوا اور بنا ہوا ہو اور وہ دوسروں کے ذہن کو بھی اسی پیٹرن پر ڈھال سکے، تراش سکے اور بنا سکے ۔

ممتاز علی کے توجہ دلانے پر میں نے نماز اور قرآن کا بھی ایک نظام فقہ کے

مطابق ہونے کی بات کو اس محدود طرزِ فکر کی علامت سمجھ کر لطف لیا۔ جہاں ہم نے اپنی زندگیوں کو قرآن کے مطابق ڈھالنے کے بجائے، قرآن اور نماز کو اپنی طرزِ فکر کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بات وہی ترتیب کے الٹ پھیر کی ہے۔ یہ الٹ پھیر سیدھا ہو جائے، اعمال و افعال میں ترتیب آ جائے، تو زندگی میں ہر طرف حسن اور توازن آ جاتا ہے۔ یہ حسن جس قدر بڑھتا ہے اسی قدر اس میں پائیداری آتی چلی جاتی ہے اور اس کی انتہا یہ ہے کہ یہ لافانی اور امر ہو جاتا ہے۔

میرے سرکار نے اس قسم کی کوئی ناصحانہ تقریر نہیں کی، انہوں نے اس پر طنز بھی نہیں کیا، اس کو برا بھلا بھی نہیں کہا۔ بلکہ ہماری توجہ اس امر کی جانب مبذول کروائی کہ ''آپ یہ دیکھیں کہ اس دور افتادہ مقام پر بھی اس قسم کی باتیں اپنا اثر جمائے ہوئے ہیں۔'' بے شک جہالت کو پھیلانے کی تو کوشش بھی نہیں کرنا پڑتی وہ تو خود رو ہوتی ہے۔ اور پھر فرمایا ''ایک بار میں انگلینڈ گیا، وہاں مجھے جس ہال میں تقریر کرنا تھی وہاں قریب قریب ہر طبقۂ فکر اور مسلک کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ہال میں تین سو افراد کے لئے گنجائش تھی اور وہاں پر کوئی ساڑھے تین سو افراد تھے۔ کافی لوگ کھڑے ہو کر تقریر سن رہے تھے۔ میں نے یہ دیکھ کر کہ ہر مسلک کے لوگ ہیں کہا۔'' کتنا اچھا ہو کہ اگر ہم خود کو بریلوی او ردیو بندی وغیرہ کہنے کی بجائے مکی اور مدنی کہنا اور کہلوانا شروع کر دیں۔ جب

ہمارا قرآن ایک، دین ایک، رسولؐ ایک، نماز ایک ہے تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم خود کو ہندوستانی شہروں کے ناموں سے منسوب کریں۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم مکی اور مدنی کی نسبت اپنائیں، تاکہ ہمیں ویسے ہی انوار بھی منتقل ہوں۔" فرمایا۔ "میرے یہ کہنے کی دیر تھی، ہال خالی ہو گیا، اختلاف منانے اور اتفاق اور یگانگت پیدا کرنے کی بات سننا تک گوارا نہیں تھا ان کو۔ دو منٹ کے بعد ہی سارا ہال خالی دیکھ کر میں بہت حیران ہوا۔ کچھ سمجھ نہ آئی کہ اچانک ہو کیا۔ پھر بعد میں سمجھ آئی، کہ یہ وجہ ہوئی کہ میں اخوت اور یکجہتی کی بات کر بیٹھا۔

ہم ایک سناٹے کے عالم میں یہ بات سن رہے تھے، اور سن کر تو اور بھی سناٹے میں آ گئے۔ "اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو" کا پیغام سر بلند کرنے والے کے تجربات ضروری تو نہیں کہ جاں فزا ہی ہوں۔ اکثر روح فرسا بھی ہوتے ہیں مگر عجیب بات ہے جو جتنے زیادہ روح فرسا لمحوں کو برداشت کرتا ہے ان کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیتا، ان سے شکست تسلیم نہیں کرتا، وہی کامیاب رہتا ہے۔

ایک بار میں نے اپنے مراد کے سامنے ان کے لئے دعا کرنے کی جسارت کی۔ مجھ بے ڈھب بندے کو بات کرنا تک تو آتی نہیں اکثر تو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کیا کہنا چاہیے تھا اور کیا کہہ گیا ہوں۔ میں نے کہہ دیا "اللہ آپ کو کامیاب کریں۔" بہت

ہی شفقت سے مجھے ڈھب پر لانے اور آئندہ ایسی ہانکی ہانکنے سے باز رکھنے کو فرمایا۔''

جب میں پہلی بار لندن جارہا تھا تو جانے سے پہلے میری ملاقات عبیداللہ درانی صاحب سے ہوئی، میں نے مشن کے کام کے حوالے سے ان سے کامیابی کی دعا کے لئے کہا۔ اس پر انھوں نے کہا'' دعا تو وہاں کی جاتی ہے، جہاں کامیابی کا یقین نہ ہو، آپ کے لئے تو میں کامیابی لکھی ہوئی دیکھ رہا ہوں۔ بھئی آپ تو سورج ہیں، نام کے بھی اور کام کے بھی۔'' فرمایا۔ میری دادی اماں بھی یہی کہا کرتی تھیں۔ ''تو تو میرا سورج ہے۔''

میرے مراد کی یہ ادا ایسی ہے کہ بات اتنی معصومیت سے کہتے ہیں جو آدمی کو مجبور کر کے رکھ دیتی ہے کہ وہ ان سے پیار کرے۔ گاڑی میں بھی مراقب رہنے کو اپنی عادت یا کاموں کی ضرورت قرار دینے کے بجائے اس کا نہایت بے ضرر اور معصومانہ سا عذر دیتے ہوئے فرمایا۔'' گاڑی چلتی ہے تو مجھے نیند آجاتی ہے۔'' ان کے مرید کو ان کی بات ماننے میں تو کوئی تامل نہ تھا مگر سوچ نے سوال پوچھنے پر ابھارا۔'' حضور گاڑی کے چلنے پر نیند کیوں آتی ہے؟''

فرمایا۔'' گاڑی چلتی ہے تو نیچے اوپر کی حرکت سے جھولے کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ جھولے کی حرکت سے آپ نے دیکھا ہوگا، بچوں کو نیند آجاتی ہے اور بھئی میں بھی تو ایک بچہ ہی ہوں نا، مجھے بھی نیند آجاتی ہے!'' مرید کے اندر تشکیک کا ناسور بہت پھیلایا

ہوا تھا، اس نے ہچکچاتے ہوئے عرض کی۔ ''حضور جھولا تو اوپر نیچے ہوتا ہے، لیکن یہ گاڑی تو سیدھی چلتی ہے اس میں اوپر نیچے کی نسبت آگے کی حرکت زیادہ ہوتی ہے'' کہا۔ ''جی ہاں یہ سارا کھیل ہی سپیڈ کا ہے۔ جوں جوں سپیڈ بڑھتی ہے، کشش ثقل ٹوٹتی چلی جاتی ہے۔ دو سو میل کی رفتار پر تو کشش بالکل ہی بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے، گاڑی کی رفتار کے زیر اثر کشش ثقل کے ختم ہونے سے ہلکا پن پیدا ہوتا ہے تو ذہن ثقل سے آزاد ہونے پر اوپر اٹھتا ہے اور بندے کو نیند آ لیتی ہے۔

یعنی گاڑی کے سیدھے چلنے سے ذہن پر اوپر نیچے ہونے کا جو تاثر مرتب ہوتا ہے، وہ ظاہر بین نظروں کو بھلا کیونکر نظر آ سکتا تھا۔ اور ادھر پیر سے مراد نے اس قدر سادہ اور سلیس انداز میں اس مشکل گتھی کو سلجھا دیا کہ ذہن میں سکون ہی سکون پھیل گیا، اب کوئی سوال نہیں اٹھ رہا تھا۔ ہم خود بھی گاڑی کے جھولے لینے میں منہمک ہو گئے۔

****

واپسی کے سفر میں انہی درختوں کو دیکھتے، انہی راستوں سے گزرتے، جن پر ہم کچھ دیر پیشتر گزر رہے تھے، ایک سوچ ابھری صبح ادھر جا رہے تھے اور اب ادھر اس کے مخالف سمت سفر کر رہے ہیں، فرق کیا پڑا؟ صبح درختوں پر روشنی مشرقی سمت سے پڑ رہی تھی ۔اب مغرب کی سمت سے۔ زاویے بدل گئے ہیں۔ صبح کی کیفیات میں تازگی کا مزہ تھا، اس وقت تھکن کا لطف آ رہا ہے۔ صبح درختوں کو اداس دیکھ کر موت کے انتظار کی کیفیت دھیان میں آ رہی تھی، اس وقت درختوں کی اداسی کے پیچھے کسی معتبر اور معزز ہستی سے بچھڑنے کا دکھ نظر آ رہا تھا۔ مرید نے اپنے مراد کو دیکھ کر سوچا۔

کاکڑہ ٹاؤن کے قریب پہنچے تو سورج غروب ہونے کو تھا۔ پہاڑوں میں سورج یوں بھی جلد چھپ جاتا ہے۔ شام پڑنے سے لے کر رات ہونے کا وقفہ میدانی علاقوں کی نسبت طویل ہوتا ہے۔ کاکڑہ ٹاؤن سے پہلے ایک ہوٹل پر رکے۔ گاڑی سے اتر کر ہوٹل کی کرسیوں پر آن بیٹھے ۔ایک طرح سے بیٹھے بیٹھے نشست تبدیل ہو گئی۔'' اس

تبدیلی کو آرام کہا جا سکتا ہے؟" مرید نے ذہن میں سوال اٹھنے پر سامنے بیٹھے مراد کی طرف دیکھا۔ سامنے ایک کرسی پر میر امراد اور دوسری پر حاجی ادریس صاحب۔ میرے بازو والی کرسی پر ممتاز علی ایک طرف سڑک کا کنارا اور دوسری طرف ہوٹل، ہم ہوٹل کے اندر کمروں کے بجائے کھلی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اندر کمروں میں گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے میرے سوال کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ ہوٹل کا مالک خود چائے بنانے۔ برتن لگوانے اور مہمانوں کی دیکھ بھال کرنے میں لگا ہوا تھا۔ ہوٹل کے مالک کو خود پر کچھ خصوصی توجہ دیتے ہوئے دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا میں نے پوچھ ہی لیا کہ کیا ان صاحب کو معلوم ہے کہ آپ کون ہیں؟ میرے مراد نے اس سوال کا جواب نہیں دیا البتہ حاجی ادریس صاحب کہنے لگے "یہ لوگ بہت سمجھدار ہوتے ہیں انہوں نے یہ دیکھ کر کہ ہم سب ایک ہی بندے کی ہمراہی میں آئے ہیں اور یہ کہنے کی بات نہیں نظر آ رہا ہے کہ ہمارا بڑا کون ہے لہذا وہ باقی سب کا مان بڑھانے کو ان پر زیادہ توجہ دے رہا ہے۔" میں حاجی صاحب کی بات پر کچھ زیادہ دھیان دیئے بغیر اسی کو دیکھتا رہا۔ اس نے جس طرح چائے خود لا کر دی اور چائے دے کر جس طرح سے وہ پیچھے ہٹا وہ محض کاروباری انداز کی توجہ نہ تھی اس توجہ میں عقیدت کا رنگ شامل تھا اور عقیدت کا رنگ اتنا گہرا اور اتنا واضح ہوتا ہے کہ مجھ ایسا کوڑھ مغز بھی اس رنگ کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تجسس نے میری توجہ اس بندے پر مبذول کروائے رکھی ۔ ہم نے چائے کا بل مانگا تو اس نے انکار کر دیا ۔ ’’یہ تو میرے نصیب ہیں کہ آپ نے غلام کو یہ اعزاز بخشا کہ مجھ فقیر کے ہاں آئے ۔ میری اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو گی کہ ایک اللہ والے نے اپنے دوستوں کے ہمراہ مجھ سے چائے پی ۔ آخرت میں میری نجات ہو گئی ۔‘‘ میں بالکل ہی چکرا کر رہ گیا ۔ اس بندے نے صرف ایک فرمائش کی ۔ وہ مخاطب تھا حاجی صاحب سے لیکن اس کی نظریں حضور پر چپکی ہوئی تھیں ۔ ’’آپ میرے لئے اپنے پیرومرشد سے دعا کروا دیں ۔‘‘ حاجی صاحب نے اپنے پیرومرشد کی خدمت میں باقاعدہ عرض کی ۔ ’’حضور ان کے لئے دعا فرمائیں ۔‘‘

میرا سرادا اٹھ کر ہوٹل کے کاؤنٹر کے قریب گیا ۔ ہم میں سے کچھ گاڑیوں میں بیٹھ چکے تھے کچھ ان کے پیچھے کھڑے تھے ۔ انہوں نے وہاں کھڑے ہو کر ہاتھ بلند کئے ۔ دعا کی ۔ سب نے اس ہوٹل والے کا شکریہ ادا کیا اور جا کر گاڑیوں میں بیٹھنے لگے ۔ میں پیچھے رہ گیا ۔ میں نے ہوٹل والے سے پوچھ ہی لیا ۔ ’’آپ کو یہ اندازہ کیسے ہو جاتا کہ کون سا بندہ اس قابل ہے کہ اس سے دعا کے لئے کہنا ہے ۔‘‘ اس کا جواب نہ تو کسی فلسفی کا جواب تھا اور نہ اس میں کوئی انکشاف ۔ اس نے صرف اتنا کہا ۔ ’’صاحب ہمیں کیا پتہ یہ تو اللہ نے میرے دل میں ڈال دیا کہ ان صاحب سے دعا کروا لے ۔‘‘

جب میں سلسلہ عالیہ عظیمیہ میں داخل ہوا تو مرشد کریم نے خالد نیاز صاحب کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ایک کام کے سلسلے میں مجھ سے ملا کریں۔ اس دوران خالد نیاز نے مجھے بہت سی باتوں سے آگاہ کیا۔ ایک بار انہوں نے مرشد کریم کے حوالے سے بتایا کہ جب بندہ اللہ سے پیار کرتا ہے تو اللہ اس کے پیار کو آزمانے کو اسے آزمائشوں میں ڈالتا ہے اور جب بندے کو اللہ پیار کرتا ہے تو اس کی بابت وہ فرشتوں کو مطلع کر دیتا ہے کہ فلاں بندہ میرا محبوب ہے۔ فرشتے یہ اطلاع پا کر آسمانوں میں منادی کر دیتے ہیں کہ فلاں بندے کو اللہ نے اپنا محبوب قرار دے دیا ہے۔ یہ منادی سن کر ملائکہ عنصری لوگوں کے دلوں میں اس بندے کی محبت ڈال دیتے ہیں۔ اس محبت ہی کی زیر اثر لوگ اس بندے کو دیکھتے ہیں تو ان کے دل اس کی طرف کھنچتے ہیں اور ان کے دلوں میں اس بندے کے لئے پیار جاگ اٹھتا ہے۔

میں گاڑی میں بیٹھا۔ جذبات کی امڈتی لہروں میں محبت اور تشکر کے رنگوں کی آمیزش کا منظر دیکھتا رہا۔ میں مرشد کریم کو دیکھتا تو دل میں ان کی محبت کی کشش پاتا اور اس کشش کو دیکھتا تو ایک احساس تشکر اپنے اندر بھرتا پاتا۔ اللہ تیرا شکر کہ آج تو نے ہمیں بھی اللہ والوں کے دوستوں میں شامل کیا۔ یہ ایک اعزاز تھا۔ ایک اعزاز ہے اور اعزاز رہے گا۔ اس پر ہمیں ناز ہے اور ناز رہے گا۔

رات مراقبہ ہال میں کھانے کے بعد باتیں ہو رہی تھیں۔ سب اپنے مراد کے گرد جمع ان کی قربت میں سرشار سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صاحب آئے کھسکتے سرکتے وہ مرشد کریم کے قریب آ گئے ہم سمجھے انہوں نے کوئی ذاتی بات کہنی ہے اس لئے ان کو جگہ دیتے رہے۔ انہوں نے حضور کے کان میں کچھ کہا۔ انہوں نے سر ہلایا اور انہوں نے ٹانگیں دبانا شروع کر دیا۔ ایک دو منٹ دبا کر انہوں نے ان سے سیدھا ہو کر لیٹنے کی فرمائش کی۔ میں نے سوچا جس بندے سے بات کرنے میں ہم ہمت مجتمع کرتے رہ جاتے ہیں اور اکثر بات حلق میں اٹک کر رہ جاتی ہے اس آدمی کی دیدہ دلیری تو دیکھئے کہ آ کر کس طرح سے اس نے سیدھے سیدھے ٹانگ پکڑ لی اور اب بیٹھا کس مزے سے ان کو چھو رہا ہے ان کو دبا رہا ہے۔ یہ ہمت ہمیں تو کبھی نہیں ہوئی۔ ہم کہیں بھی تو منع کر دیا جاتا ہے کہ آپ میری عادت خراب کر دیں گے۔ میں عادی ہو گیا، تو کیا کروں گا۔ اور اب یہ آدمی کس مزے سے لگا ہوا ہے، ان کو دبانے میں۔ اس کے یہ کہنے پر کہ آپ سیدھے ہو کر لیٹ جائیں، انہوں نے کہا، ''بس اب میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں، آپ کا شکریہ۔ اب میں سوؤں گا۔'' یہ کہہ کر حضور اٹھ کر چلے گئے۔ ان صاحب نے کھسک کر جگہ بنائی اور ممتاز علی سے پوچھا، ''اگر اجازت ہو تو میں آپ کو دبا دوں۔'' نہ جانے کیوں ممتاز علی ہنس پڑے اور کہا ''میں نے کبھی دبوایا نہیں، مجھے گدگدی ہوتی ہے۔

"ان صاحب نے ایک دو اور بھائیوں کو دبانے کی فرمائش کی مگر سب نے منع کر دیا۔ شاید اس لئے کہ وہ بندہ جوان کے مرشد کو دبا چکا ہے، اس سے خدمت لینا کہیں گستاخی ہی نہ ہو۔

اس آدمی سے گپ شپ ہوئی پتہ چلا کہ وہ مراقبہ ہال کے ساتھ بنے ہوئے گھر میں رہتا ہے، اور یوں ہمارا ہمسایہ ہے۔ بیوی اس کی لڑاکا ہے۔ دو بچیاں ہیں۔ روزگار نہیں ہے، اس نے جب سنا کہ بڑے پیر صاحب آئے ہیں تو یہ سوچ کر کہ اس کی خدمت کروں گا، ان سے دعا لوں گا، یہاں آیا تھا۔ کیسی کیسی خواہشات لے کر لوگ اللہ والوں کے ہاں آتے ہیں اور وہ ان کی خواہشات کو کس کس طرح پورا کرتے اور انہیں آسودگیاں بخشتے ہیں۔ میں نے حاجی صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ بڑے پیر صاحب کے نمائندے ہیں، آپ نے ان سے دعا کیوں نہیں کرائی۔ اس نے کہا "ان کی دعا اپنی جگہ مگر بڑے تو بڑے ہی ہوتے ہیں نا۔" کن سادہ اور موثر الفاظ میں وہ ہمیں طریقت اور سلوک کا قاعدہ پڑھانے بیٹھ گیا۔ اللہ اکبر کا بھی تو یہی مفہوم ہے۔ وہ جو سب سے بڑا ہے، سب بڑوں کا بڑا۔ سب کا بڑا، دنیا میں ہر شے کا اپنا مقام اور اپنی اہمیت مگر بڑے کا کیا کہنا۔ بڑا تو آخر بڑا ہی ہوتا ہے نا۔ اس کی بات سن کر بھی یہی بات ذہن میں آئی۔ "اللہ اکبر" کہہ کر ممتاز علی نے سونے کا کہا اور دراز ہو گئے۔

****

آج جمعہ کا دن ہے۔ مراقبہ ہال میں صبح سویرے سے ہی چہل پہل اور گہما گہمی ہے۔ نماز، مراقبہ، ناشتہ اور اس کے فوراً بعد مریضوں اور آنے والے مہمانوں سے ملاقات۔ جمعے کے دن میرے مرشد کی مصروفیات خواہ وہ کراچی میں ہوں۔ لاہور میں ہوں، یا کاکڑہ ٹاؤن میں کچھ اس نوعیت کی ہوتی ہیں کہ صبح سے شام تک یہ دن عوام کے لئے مختص ہوتا ہے۔ مریض اور ایسے ایسے لاعلاج امراض کے مریض جنہیں طب جدید کے ڈاکٹروں نے اپنی نااہلی کے اعتراف کے بعد ہسپتالوں سے فارغ کر دیا ہوتا ہے اور ان کے لواحقین کو صاف صاف کہہ دیا ہوتا ہے کہ اب ہم مزید کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ دعا کریں۔ انہیں گھر لے جائیں۔ ان کی خدمت کریں، فالج اور کینسر، ناکارہ پھیپھڑوں اور عجیب وغریب امراض کے مریض یہاں آتے ہیں اور میرا مرشد ان کی دیکھ بھال، ان کے علاج تجویز کرنے میں اتنا منہمک کہ یہ مصروفیت، سب مصروفیات پہ حاوی اور اہم ہو جاتی ہے۔ لوگ آتے ہیں۔ نگران حضرات ان کو بٹھاتے ہیں اور باری

باری ملوادیتے ہیں ۔لوگ مل کر باہر آتے ہیں، تو ان کے چہروں پر ایک عجیب سی طمانیت ہوتی ہے ۔بعض تو خوشی کے مارے پھولے نہیں سمارہے ہوتے ۔میں نے آج تک ہزاروں لوگوں کو اپنے مراد کے کمرے میں جاتے بھی دیکھا ہے، اوران کو باہر آتے بھی ۔ اندر جانے سے پہلے ایک تناؤ، پریشانی اور گھبراہٹ کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے ۔باہر آتے ہیں، تو نوے فیصد افراد کے چہروں پر سکون، طمانیت اور مسکراہٹ ہوتی ہے ۔ 10 فیصد کے چہرے حیرت، استعجاب یقین نہیں آتا، اور دیکھیں گے، کی کیفیت کے اثرات لئے ہوئے ہوتے ہیں، میں نے گھنٹوں بیٹھ کر یہ منظر دیکھے ہیں ۔ان مناظر میں بعض تو ایمان کو تازہ ہی نہیں کرتے پیدا کر کے رکھ دیتے ہیں ۔مریض کندھوں پر سوار آتے ہیں اور پیروں پر چل کر جاتے ہیں ۔بعض کی حالت ڈوبنے کی سی ہوتی ہے، وہ کچھ اس طرح سے ہاتھ پیر مار رہے ہوتے ہیں، جیسے ڈوب رہے ہوں اور جب جاتے ہیں تو خود کو پانی پر تیرتا ہوا محسوس کرتے ہیں ۔اکثریت باہر آکر ہاتھ میں پکڑی پرچی لے کر کسی سے اس کی تشریح کرواتے ہیں، جو عموماً نگران مراقبہ ہال کرتے ہیں، کیوں کہ لوگ روحانی طرز علاج سے مانوس ہوتے ہیں اور اس کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہیں ۔مرشد کریم علاج میں رنگ اور روشنی سے علاج، طب یونانی یا روحانی مجربات میں سے کوئی آزمودہ نسخہ مرحمت فرماتے ہیں ۔بعض تو اصرار کرتے ہیں کہ آپ ہمیں دم

کر یں۔اوران پر کچھ پڑھ کر پھونک دیا جاتا ہے۔

دم کرنے کا ایک عجیب واقعہ مجھے اقبال احمد قریشی صاحب نے سنایا۔ایک صاحب نے قادری صاحب سے کسی بات پر اختلاف کیا۔موضوع عشق کی کیفیت رہا ہو گا۔ان صاحب نے قادری صاحب سے کہا آئیں، چل کر ابا حضور سے پوچھ لیتے ہیں، کہ عشق کیا ہوتا ہے۔قادری صاحب نے منع کرتے ہوئے کہا،''فقیر بات سمجھانے کو وہ بات وارد کر دیا کرتے ہیں۔'' ان کو چین کہاں موقع کی تلاش میں رہے۔ایک وقت ایسا مل ہی گیا۔قادری صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے مرشد کریم سے سوال کر دیا۔''حضور یہ عشق کیا ہوتا ہے؟'' پیشتر اس کے کہ حضور جواب دیتے ،قادری صاحب نے سر سے ٹوپی اتاری اور سر جھکاتے ہوئے آگے کیا اور کہا حضور مجھے تو دم کر دیجئے۔مرشد کریم نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا، کچھ پڑھ کر پھونک دیا۔ان صاحب نے اپنا سوال دہرایا۔ ابا نے ان کو جواب میں کچھ کہا، شاید یہ کہا کہ'' جب ہوگا، تو پتہ چل جائے گا۔''

اس کے بعد کرنا خدا کا کیا ہوا، وہ صاحب عشق بلاخیز میں گرفتار ہوئے، کھانا ،پینا،سونا، جاگنا سب ہوش اڑ گئے۔کتنے ہی ماہ وہ گرفتار بلا رہے۔ایک روز گھر والے پکڑ کر حضور کے پاس لائے، کہ حضور انہیں کچھ ہو گیا ہے۔اچھے بھلے بیٹھے ہوتے ہیں، کپڑے پھاڑ دیتے ہیں، گھر سے نکل جاتے ہیں، ان کے ہوش ٹھکانے نہیں۔

بدنام ہو رہے ہیں اور کر رہے ہیں، ان پر دم کر دیجیے۔ حضور نے دم کر دیا، ہوش ٹھکانے آ ئے، قادری صاحب کے بدلہ تبخی اور دل لگی بازی سے ون آ گاہ نہیں۔ بعد میں اکثر انہیں یہ کہہ کر چھیڑا کرتے۔ ”ان سے پوچھیں یہ عشق کر چکے ہیں۔“

اس وارد ہونے کا ایک واقعہ خود اس مرید پر بھی گزرا، ایک بار مرشد کریم نے ارشاد فرمایا کہ ”بعض خیال ایسے ہوتے ہیں، جو آدمی کو لٹا دیتے ہیں“ مرید کے تشکیک زدہ ذہن میں آیا، بھلا وہ خیال کیسے ہوتے ہوں گے جو آدمی کو لٹا کر رکھ دیتے ہوں گے۔ مرید گھر آیا۔ اس کو ایک خط موصول ہوا۔ خط کے ہمراہ ایک لاکھ بیس ہزار روپے کا ایک ڈرافٹ تھا۔ ہدایات یہ تھیں کہ اس ڈرافٹ پر دستخط کر کے فوراً واپس بھجوائیں۔ اگلے روز اس جمع کروانے کی آخری تاریخ تھی۔ اگر یہ دستخط شدہ ڈرافٹ اگلے روز وہاں نہ ہوا، تو بڑی پریشانی ہو جائے گی، لائسنس کینسل ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

مرید نے دستخط کر کے ڈرافٹ کو لفافے میں ڈالا اور لے کر کوریئر کمپنی کے دفتر چلا گیا، انہوں نے کہا ہم ڈرافٹ وغیرہ نہیں لیتے۔ ان سے کہا گیا کہ یہ ڈرافٹ ابھی آپ ہی کی معرفت تو ملا ہے۔ جب آپ وہاں سے یہاں لا سکتے ہیں، تو لے جانا بھی چاہیے۔ بات بڑھ گئی، انہوں نے کہا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آپ نے جو کرنا ہے کر لیں، ہم یہ لفافہ نہیں لے جانے کے۔

اب معاملہ سیریس ہوا شروع ہو گیا۔ دوسری کوریئر سروس کے دفتر رجوع کیا، نہ جانے کیا بات تھی، کہ انہوں نے بھی لفافہ کھول کر دیکھنے پر اصرار کیا، اور ڈرافٹ دیکھ کر انکار کر دیا۔ ان سے کہا بھی کہ یہ سرکاری معاملہ ہے اور پھر CROSS ڈرافٹ ہے، آپ سے کوئی بازپرس نہیں ہوگی۔ ہم آپ کو بری الذمہ قرار دیتے ہیں، مگر نہ نہ ہی رہی۔ اس میں شام کے چار بج گئے۔ کسی دوسرے دفتر کی تلاش میں جا رہا تھا، ایک صاحب جاننے والے ملے۔ انہوں نے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ کر ماجرا دریافت کیا، پورا قصہ سن کر کہا یہ کیا مشکل ہے، ادھر لاؤ یہ لفافہ اور ڈرافٹ نکال کر اس لفافے کو پھاڑ کر نیا لفافہ منگوا کر اس پر پتہ لکھا۔ ڈرافٹ اس میں ڈالا اور کہا ''آئیں'' پوچھا۔ ''کہاں ---؟'' ''وہیں جہاں سے اسے بھجوانا ہے۔'' قصہ مختصر کہ وہ اس مرید کو ساتھ لے کر دو چار دفاتر میں گئے۔ انہیں بھی انکار ہوا۔ اب شام کے چھ بج چکے تھے اور سات، آٹھ بجے تک اگر یہ لفافہ روانہ نہ ہوا، تو کل کسی قیمت نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اتنے میں ان صاحب کو ایک دوست کا خیال آیا، وہ کسی کوریئر سروس کے مالک تھے۔ ہم ان کے دفتر پہنچ گئے۔ وہاں ان کے وہ دوست دروازے پر ہی مل گئے، ان سے خیر و عافیت کے بعد لفافہ ان کے حوالے کیا، انہوں نے رسید دی، اور لفافہ اٹھا کر نہایت لاپروائی سے ایک بوری نما تھیلے میں پھینک دیا۔ پوچھا جہاز کتنے بجے جائے گا، انہوں نے کہا گیارہ بجے۔

چلیں خیر ہو گئی۔

یہ مرید ان صاحب کو لے کر سیدھا اپنے گھر لے آیا۔ ان کی تواضع کی۔ ان کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی مدد سے یہ مسئلہ حل ہوا وغیرہ۔ ان صاحب نے نے اصرار کیا کہ انہوں نے کہیں جانا ہے۔ اس لئے آج گپ شپ نہیں کرتے، وہ پھر کسی اور روز آئیں گے۔ مرید نے دو چار بار اصرار کیا۔ انہوں نے انکار کیا، اب شک نے مرید کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا، یہ بندہ بیٹھ جائے تو جانے کا نام ہی نہیں لیتا، آج یہ جانا کیوں چاہ رہا ہے۔ کہیں یہ اپنے اسی دوست کے پاس جا کر وہ ڈرافٹ تو نہیں لینا چاہ رہا۔ اب ایک جنگ چھڑ گئی، ان صاحب کا اصرار کہ انہیں کام سے جانا ہے، اس کا اصرار کہ کھانا کھا کر جائیں۔ خیر وہ نہ مانے یہ انہیں بظاہر بہت تپاک سے رخصت کرنے گئے۔ جہاں انہوں نے جانا تھا، انہیں خود پہنچانے گیا۔ صرف اسی وسوسے اور اندیشے کے تحت کہ کہیں یہ وہیں نہ چلے جائیں، اور جا کر ڈرافٹ نہ لے لیں۔ وہ جس جگہ اترے یہ انہیں کھڑا دیکھتا رہا، پھر اپنے گھر آ گیا۔ رات کو دس بج گئے۔ اب اس کے ذہن میں شک ایک آکاس بیل کی مانند پھیل رہا تھا۔ وہ صاحب وہاں سے اتر کر جس گھر گئے، اس گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر اس کوریئر سروس کے دفتر تک پہنچنے میں انہیں دس منٹ لگے ہوں گے، انہوں نے اپنے دوست کو کوئی کہانی سنا کر اس لفافے میں سے ڈرافٹ نکال

لیا ہوگا، اور اب اس اس کو کیش کروانے کو بھاگ دوڑ کر رہے ہوں گے۔ مجھے ان سے بات ہی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ وہ پیسے کے معاملات میں ہیں بھی کچھ ندیدے سے۔ اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ پریشانی کے ہاتھوں کچھ سمجھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ بیوی، بچے سو گئے تھے۔ یہ ٹہل رہے ہیں، مگر ذہن میں ایک ہی خیال کہ وہ صاحب ڈرافٹ لے کر بھاگ گئے ہوں گے، خود کو کوس رہے ہیں۔ رات کے دو بجے تک یہی بے چینی رہی۔ بالآخر نڈھال ہو کر لیٹ گئے اور دعائیں کرنے لگے۔ اے اللہ تو اس آفت سے نجات دے۔ صبح اذان کی آواز پر آدھے سوئے، آدھے جاگے، اٹھے کہ ایک آواز کان میں آئی۔ ''ایسے ہوتے ہیں، وہ خیال جو آدمی کو لتا کر رکھ دیتے ہیں!'' یا بدیع العجائب، یہ کیفیت وارد ہو گئی، الٰہی میری توبہ۔ آئندہ کبھی مرشد کریم کی بات پر اس طرح گستاخانہ انداز میں معترض نہیں ہونگا۔ استغفر اللہ، آج بھی وہ اذیت ناک رات یاد آتی ہے، تو خیال کی طاقت کا مزید معترف ہو جاتا ہوں۔

یہ شک اور بے یقینی ہی تو ہے جو انسان میں بیماریوں کی صورت میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ یہ شک اور بے یقینی ختم ہو جائے تو انسان پر یقین اور پر امید ہو جاتا ہے۔ امید کی نا اگر بندوں سے جڑ جائے، تو بندہ خود فریبی کا شکار ہو کر مایوس ہوتا ہے اور اگر امید کی نا اللہ سے جڑ جائے تو بندے کے اندر استغنا کا درخت شاخ در شاخ پھیلتا جاتا

ہے،، اور جوں جوں اس درخت کا پھیلاو بڑھتا ہے بندہ اس کی گھنی ہوتی چھاؤں کے مزے سمیٹنے لگ جاتا ہے۔ چھاؤں کا خیال ایک طرف آرام اور سکون سے وابستہ ہے تو دوسری طرف اس میں پناہ اور تحفظ کا احساس بھی فزوں تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

ہم نمازِ جمعہ کے لئے کاکڑہ ٹاؤن کی جامع مسجد گئے۔ راستے میں حاجی ادریس صاحب حضور کو بتا رہے تھے کہ وہاں کے مولوی صاحب ان سے نظریاتی طور پر اختلاف رکھتے ہیں اور ان کی تکذیب تک کرنے سے نہیں چوکتے۔ مراقبہ ہال سے مسجد تک ایک ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ ہوگا۔ مولوی صاحب کی باتیں ہوتی رہیں۔ مسجد میں داخل ہوئے، تو حضور نے سنتیں ادا کیں اور اپنے مخصوص انداز میں نماز کے لئے جماعت کے کھڑے ہونے کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب خطبہ سے پہلے وعظ کر رہے تھے۔ وعظ ختم کرنے سے پیشتر انہوں نے اعلان کیا ''معروف روحانی سکالر جناب خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کراچی سے کاکڑہ ٹاؤن تشریف لائے ہیں اور بعد از نماز عصر وہ مراقبہ ہال کاکڑہ ٹاؤن میں روحانیت کے موضوع پر خطاب کریں گے۔ لوگوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔'' یہ اعلان شاید وہ لکھا ہوا پڑھ رہے تھے۔ اعلان پڑھنے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ وہ یہ کیا کر بیٹھے ہیں۔ اس پر انہوں نے اتنا ہی کہا کہ لوگ بے شک وہاں جائیں اور بات کو سوچ سمجھ کر سنیں۔ پھر خطبہ پڑھا، دو رکعات نمازِ فرض

پڑھ کر میں نے دائیں طرف دیکھا۔ دیکھا کہ مرشد کریم مسجد سے باہر جا رہے ہیں اور ان کے ہمراہ حاجی ادریس صاحب بھی ہیں۔ میں نے تیزی سے اس طرف دوڑنے کا ارادہ کیا جدھر اس کے جوتے پڑے تھے کہ ممتاز بھائی نے اس کو اشارہ کیا کہ آپ مرشد کے ہمراہ جائیں، میں آپ کا جوتا بھی لے کر آ جاتا ہوں۔ میں تیزی سے اپنے مراد کے لئے دوڑا۔ جب وہ مسجد کے گیٹ پر پہنچا تو مرشد کریم مسجد کی سیڑھیاں اتر کر چند قدم آگے جا چکے تھے، میں نے تیزی سے سیڑھیاں اتر کر ننگی زمین پر پاؤں رکھا۔ ابھی ایک دو قدم ہی لئے تھے کہ حضور چلتے ہو فرمایا۔ ''بھئی آپ کے جوتے کہاں ہیں؟'' میں تو جیسے سُن ہوکر وہیں جم کر رہ گیا۔ جس حالت میں تھا، وہیں Freez ہو گیا۔ منہ سے فقط اتنا نکلا۔ '' آ رہے ہیں۔ وہ ممتاز بھائی لا رہے ہیں۔'' اب ہم انتظار کر رہے ہیں کہ ممتاز بھائی آ گئیں، میرا مراد میرے ہمراہ انتظار کر رہا ہے، حاجی صاحب نے کہا حضور'' یہ تو کمال ہو گیا۔ میرے مراد نے ان کی طرف دیکھا کہ ان کا اشارہ کس کمال کی طرف ہے۔ انہوں نے مولوی صاحب کے اعلان کا تذکرہ کیا۔ وہاں وہی پرسکون مسکراہٹ لبوں پر سجائے بات سنی گئی۔'' ''یہ مولوی صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔'' کہاں حاجی صاحب کا ان کو کمتر قسم کا مولوی کہنا اور کہاں ان کا ان کو اچھا کہنا۔ اتنے میں ممتاز بھائی نے جوتے لا کر دیئے۔ میں نے جوتے زمین پر رکھ کر پاؤں ان میں ڈالا اور یہی کہہ کر رہ

گیا۔ ایک بڑا سا کانٹا تلوے سے چبھا ہوا تھا۔ اس نے کانٹا نکالا اور سوچ میں پڑ گیا، اگر حضور نہ رکتے تو وہ بے محابا ان کے پیچھے دوڑتا۔ ہو سکتا ہے کہ کانٹا دور تک اندر اتر جاتا یا اندر ہی ٹوٹ جاتا، مگر نہیں جب مرید اپنے مراد کے ہمراہ ہو تو راستے کا ہر کانٹا بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے، ماں بھی تو اپنے بچوں کے پیر میں کانٹا چبھنے پر تڑپ اٹھتی ہے، مرشد کریم نے ماں سے بڑھ کر پیار کا اظہار فرمایا، ماں کانٹے کو چبھنے سے نہیں روک سکتی، چبھنے کے بعد تڑپتی ہے، مرشد نے کانٹے کو چبھنے سے پہلے ہی روک دیا تھا، مرید گھیرے میں لینے والی شفقت کے تاثر میں ڈوبا۔ ایک بے پایاں پیار کے محیط ہونے کا احساس لئے۔۔۔ نم دیدہ، نم دیدہ اپنے مراد کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ آرام کرنے کے بعد لوگوں سے ملنے کا سلسلہ دوبارہ آغاز ہوا اور نمازِ عصر تک جاری رہا، نمازِ عصر کے بعد خطاب ہوا۔ اس خطاب کو سننے کہاں کہاں سے لوگ وہاں پہنچے تھے، یہ بات بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایسی ایسی دور افتادہ جگہوں کے نام سنے کہ حیرت ہوئی کہ وہاں یہ اطلاع کیونکر پہنچی ہوگی۔ مرید کے ذہن میں وہ بینر لہرایا جو اس نے میرپور کے چوک میں لہراتا دیکھا تھا۔ وہاں سے اطلاع ہوا کے دوش پر کہاں کہاں پھیل گئی۔ جہلم اور پنڈی تک سے لوگوں کا وہاں پہنچنا تو سمجھ میں آ رہا تھا، مگر پشاور، مردان اور سوات سے لوگوں کا وہاں آنا۔ ہمیں یہ سمجھ آتی تو کیا اور

نہ آئی تو کیا۔

خطاب شروع ہوا۔ سامعتوں کے دام چھلے۔ میرے سراد کی مدھر نرم اور کومل سی میٹھی آواز قلب و روح میں گداز گھولتی چلی جا رہی تھی۔ وہ خواتین و حضرات کہہ رہے تھے۔" آپ حضرات تشریف لائے۔ اس مجلس میں دو روزہ دیگ پنڈی و جہلم سے آپ کا آنا، اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے دل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت سے معمور ہیں اور آپ سب خواتین و حضرات وہ طریقہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ جس پر چل کر آپ حضور ﷺ کی زیارت سے مشرف ہو سکیں، آپ کو ان ؐ کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔"

" جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے، مختلف طرح کے لوگ یہاں آتے رہے، جاتے رہے ہے یہاں جو بھی انسان حیوان یا پودا پیدا ہو گیا۔ اس پر موت آنا لازم ہے۔ ہر شے کی عمر کا ایک تعین ہے۔ درختوں کی عمریں انسانوں اور حیوانوں سے بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ سب سے زیادہ عمر پہاڑ کی ہوتی ہے، مگر بالآخر وہ بھی مر جاتے ہیں۔ اس تمام بات کا مدعا یہ ہے کہ یہاں سب کچھ عارضی اور ختم ہو جانے والا ہے۔"

" دنیا ایک عارضی قیام گاہ سے کچھ زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ دنیا ایک مسافر خانہ ہے۔ یہاں نہ تو آدمی اپنی مرضی سے آتا ہے، اور نہ ہی اپنی مرضی سے جاتا ہے، اگر پیدائش پر انسان کو اختیار رہوتا، تو سب بادشاہ کے یہاں پیدا ہوتے۔ اللہ نے ہمیں یہاں

ایک وقتِ معینہ کے لئے بھیجا اور یہاں سے واپس پلٹ کر جانا طے کر دیا۔ ہم کو یہاں اپنی ڈیوٹی پوری کرنا ہے۔ دنیا کی زندگی میں انسان دو طرح سے زندگی گزارتا ہے۔ یہ دونوں زندگیاں ایک طرح کی ویڈیو فلم ہیں۔ کراماً کاتبین بندے کی ایک ایک حرکت ایک ایک لمحے کی فلم بناتے ہیں۔ اگر اچھے اعمال کی فلم زیادہ طویل ہے، تو وہ خوش ہوتا ہے اور اگر فلم میں بد اعمالیاں اور نافرمانیاں زیادہ آئیں تو جب وہ فلم دیکھتا ہے، تو وہ روتا ہے۔ اگر وہ فلم رونے کی، دہشت ناک مناظر کی فلم ہے تو ہم پر برا اثر پڑتا ہے، ہم اس فلم کو اتنے انہاک سے دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اس فلم کے تمام تاثرات ہم پر طاری ہو جاتے ہیں۔ اور اگر ہم نے کوئی اچھا کام کیا ہوگا، تو وہ سب اس فلم پر آ جانے کے سبب ہم اس فلم کو ایک اچھی فلم کہیں گے اور اگر ہم نے اچھے کام نہیں کئے ہوں گے، تو وہ بھی اس فلم پر آ جائے گا۔ پیدائش سے موت تک کا وقفہ ایک فلم کی طرح ہم سے چپکا ہوا ہے۔ اگر انسان سے ایک ذرہ برابر اچھائی ہوئی ہے، تو وہ بھی اسے دیکھ لے گا، اور اگر ذرہ برابر برائی ہوئی ہے، تو وہ بھی دیکھ لے گا، پوری زندگی ایک ریکارڈ ہے۔ ایک ایسا ریکارڈ جہاں ہاتھوں پیروں کی گواہی ہوگی۔ اچھے برے عمل ہوں، خیر کے کام ہوں، یا شر کے، انسان کے خود اپنے ہاتھوں پیروں کی گواہی ہوگی۔"

"وہ سٹیج جہاں یہ فلم بنتی ہے، اس سٹیج کو ہم مسافر خانے کے علاوہ اور کچھ نہیں

کہہ سکتے۔ ابراہیم بن ادھم کے پاس ایک فقیر آیا۔ فقیر کے چہرے پر کچھ ایسی بات تھی کہ کوئی اس فقیر کا راستہ نہ روک سکا۔ فقیر نے کہا مجھے رہنے کو جگہ چاہیے، حضرت ابراہیم بن ادھم نے اس کو کہا تم جا کر کسی سرائے میں ٹھہرو، یہاں کہاں آ گئے۔ فقیر نے پوچھا تو یہ کون سی جگہ ہے۔ ادھم نے کہا یہ تو میرا محل ہے۔ فقیر نے پوچھا آپ سے پہلے یہاں کون رہتا تھا، بتایا کہ میرا باپ۔ پوچھا کہ اس سے پہلے بتایا میرا دادا۔ اس نے پھر پوچھا اور اس سے پہلے بتایا کہ فلاں بادشاہ۔ فقیر نے کہا تو پھر سرائے اور کیا ہوتی ہے۔ آپ کا یہ دربار بھی ایک مسافر خانہ ہی تو ہے۔"

''اس واقعے نے حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ انہوں نے دربار چھوڑ دیا، محل چھوڑ دیا، بادشاہت چھوڑ دی اور ایک تکیہ، ایک پیالہ اور ایک جائے نماز لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک آدمی اوک (دونوں ہاتھوں کے چلو ملا کر) سے پانی پی رہا ہے۔ انہیں نے اسے دیکھا تو اپنا پیالہ اس دے دیا۔ پھر ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ صاف ہموار زمین پر نماز پڑھ رہا ہے، تو انہوں نے اپنا مصلا پھینک دیا۔ ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ بازو سر کے نیچے رکھے سو رہا ہے، اس پر انہوں نے سرہانہ بھی پھینک دیا۔ بیٹا جوان ہوا تو اس کو خیال ہوا کہ میرا باپ کہاں ہے۔ وہ تلاش میں نکلا اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے باپ کو تلاش کر ہی لیا۔ دیکھا کہ باپ دریا کنارے

ایک کٹیا کے باہر بیٹھا گدڑی سی رہا ہے۔ باپ سے ملا اپنا تعارف کرایا۔ باپ خوش ہوا کہ اللہ نے میرے دل کی خواہش پوری کر دی اور بیٹے کو جوان دیکھا۔ بیٹے نے باپ سے اپنے ہمراہ چلنے کی درخواست کی۔ ظاہر ہے باپ نے انکار کر دیا۔ اس پر جوان خون نے جوش مارا ہوگا، اس نے باپ کے ہاتھ سے سوئی لے کر دریا میں پھینک دی کہ آپ نے بادشاہت چھوڑ کر یہ کیا کام شروع کر دیا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم نے مچھلیوں کو مخاطب ہو کر آواز دی بھئی دیکھنا میری سوئی لا دو، انہوں نے دیکھا کہ مچھلی سطح آب پر نمودار ہوئی اور اس کے منہ میں سوئی تھی۔ انہوں نے کہا میں تو بوڑھا آدمی ہوں، کہاں نیچے اتر کر سوئی پکڑوں۔ اس پر مچھلی تڑپ کر اچھلی اور ابراہیم کو گود میں آن گری۔ انہوں نے سوئی لے کر مچھلی کو واپس دریا میں ڈالا اور بیٹے سے کہا تو نے دیکھی بادشاہی۔"

بہت اصرار سے فرمایا۔ "جو بندہ دنیا کو اللہ کے کہنے کے مطابق مسافر خانہ سمجھ لیتا ہے، اس کی حکومت ہواؤں، پانیوں اور زمینوں پر قائم ہو جاتی ہے۔"

"بچے کو اس دنیا میں آنے پر اس دنیا میں پیدا ہونے پر یہ دنیا پہلے سے بھی ہوئی ملتی ہے اور جب وہ اس دنیا سے جاتا ہے تو دنیا میں پہنے ہوئے کپڑے تک اتار لئے جاتے ہیں۔ یہ کیسا ظلم ہے۔"

"آپ پیدا ہوتے ہیں تو مانگا ہوا کپڑا پہنتے ہیں، مرتے ہیں تو مانگا ہوا کپڑا

پہنچتے ہیں، کہتے ہیں دنیا ہے ہی آنی جانی شے۔ ہر مسافر کو اس ریل سے ایک روز اترنا ہے۔ ہم اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہو سکتے، اپنی مرضی سے مر نہیں سکتے، تو ہم آخر اس دنیا میں آتے ہی کیوں ہیں۔ جب ہمیں یہ معلوم ہی نہیں کہ ہم کیوں آتے ہیں، تو پھر ہم یہاں کیوں رہنا چاہتے ہیں۔''

حضور قلندر بابا اولیاؒ نے مجھے ایک قصہ سنایا کہ ایک بوڑھا آدمی محنت مزدوری کرتے کرتے عاجز آ گیا۔ ایک روز سر سے لکڑیوں کا گٹھا گر گیا۔ اس نے سوچا کہ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ بندہ مر ہی جائے۔ یہ سوچ کر اس نے آواز لگائی۔ بھائی ملک الموت تم کہاں ہو۔ تم آتے کیوں نہیں۔ ملک الموت قریب ہی ہوں گے، مجسم ہو کر سامنے آ گئے اور پوچھا میرے لائق کیا حکم ہے؟ بوڑھے نے کانپتے ہاتھوں کا چھجہ سا بناتے ہوئے آنکھوں کے اوپر رکھا اور پوچھا اے بھائی تم کون ہو؟ اس نے جواب میں کہا'' میں ملک الموت ہوں۔ ابھی آپ مجھ ہی کو تو پکار رہے تھے۔ لیجئے میں حاضر ہوں، کوئی خدمت جو آپ مجھ سے لینا چاہیں، بوڑھے نے کہا، اے بیٹا بس اتنی سی تکلیف کرو کہ یہ گٹھا اٹھا کر میرے سر پر رکھوا دو۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔''

فرمایا ''انسان مرنا نہیں چاہتا، لیکن مر جاتا ہے۔ اس کے یہاں رہنے کو جی بھی نہیں چاہتا، لیکن رہتا بھی ہے اس کے باوجود وہ یہ نہیں مانتا کہ یہاں میرا قیام

عارضی ہے۔"

"اللہ نے ساری کائنات اس لئے پیدا کی کہ کوئی ایسی مخلوق ہو، جو اس مسافر خانے کو دیکھ کر، اس کی تزئین و آرائش دیکھ کر اس طرف متوجہ ہو کہ اس کو کس نے بنایا اور وہ جس نے یہ اتنی خوبصورتی ہر طرف پھیلا دی ہے۔ وہ خود کس قدر خوبصورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے محبت کے ساتھ مخلوق کو تخلیق کیا۔ تا کہ وہ مجھے پہچان لے۔"

فرمایا "انسان کی زندگی، انسان کی اس دنیا میں پیدائش کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس اس خزانے تک پہنچ جائے، خزانے تک پہنچنا ہی عرفان ہے، انسان اللہ کے راستے پر چل کر اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کر لے، یہ ہے اصل مقصد حیات۔"

راستہ یا برائی کا راستہ۔ رحمان کا راستہ یا شیطان کا راستہ۔ یہ فیصلہ انسان خود کرتا ہے کہ اس کو کس راستے پر چلنا ہے اللہ نے انسان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کو یہاں تک تو کہہ دیا کہ میں تمہارے اندر بیٹھا ہوں۔ تم دیکھتے کیوں نہیں۔ اور یہ کہ میں تو تمہاری رگ جاں سے بھی قریب ہوں۔ اگر انسان اللہ کے راستے پر چل پڑے۔ قدم قدم چل کر وہ عرفان کی منزل پر پہنچ جائے۔ وہ اللہ کو دیکھ لے تو اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔"

''اللہ تو وہ ہے جو ہر انسان کی زندگی کی دیکھ بھال اور مرمت پر روزانہ ایک کروڑ روپے خرچ کرتا ہے۔ ان اخراجات میں پانی، آکسیجن اور درخت شامل نہیں۔ زمین، دھوپ اور چاندنی کی بھی قیمت شامل نہیں کی گئی۔ سورج کی دھوپ نہ ہونے سے کیڑے مکوڑے پلیا پڑیں۔ چاندنی نہ ہونے سے پھل کڑوے ہو جائیں۔ ہم ماں کی محبت کی کیا قیمت ادا کرتے ہیں۔ اللہ نے یہ سب کچھ اس لئے کیا، تا کہ آپ عقل وشعور کے ساتھ یہ دیکھیں کہ آپ اللہ کے سامنے حاضر ہیں، جب آپ اللہ کو سجدہ کریں، تو آپ کو محسوس ہو کہ آپ کا سر اس کے پیروں میں رکھا ہے۔''

''اگر اللہ اپنی جان ہم میں نہ ڈالتا، تو ہم کہاں ہوتے، کیا ہوتے، انسان وہ واحد مخلوق ہے، جس میں یہ سکت ہے کہ وہ اللہ کو دیکھ سکتا ہے، دیکھ کیا سکتا ہے، دیکھ چکا ہے۔''

الست بربکم۔ قالو بلی، کی آیت پڑھ کر اس کی تشریح کرتے ہوئے

آپ ہیں ہمارے رب یعنی روح نے اللہ کو دیکھ کر اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا۔ اور روح کیا ہے؟ روح ہمارے اندر رہتی ہے، روح نہ ہو تو ہم مردہ ہیں۔ کبھی کسی مردہ جسم نے کوئی حرکت نہیں کی۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ جب تک اس جسم میں روح ہے۔ آپ

ہیں ورنہ کچھ بھی نہیں ۔ جب انسان اپنی روح سے واقف ہوتا ہے، تو وہ اللہ کا مقصد پورا کر دیتا ہے، جس کے لئے اس کو تخلیق کیا گیا تھا۔ اللہ کہتا ہے کہ میرے بندے میرے بنائی ہوئی نشانیوں میں غور کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ واہ کیا اللہ ہے!''

''اگر اللہ کی رحمت محیط نہ ہو تو بندہ زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ ہمیں اس لئے یہاں بھیجا گیا ہے کہ ہم ہر عمل خوشی سے کریں۔ ہر عمل پر خوش ہو کر اللہ کا شکر ادا کریں۔''

اس تقریر دل پذیر کے بعد سوال جواب ہوئے۔ لوگوں نے مختلف سوال پوچھے۔ جس جس کے ذہن میں جہاں کوئی الجھن، کوئی رکاوٹ تھی، کسی بات کو سمجھنے میں کوئی دشواری تھی، یا بات کو وضاحت درکار تھی، اس نے سوال پوچھے۔ زیادہ تر سوال نماز کے متعلق پوچھے گئے۔ لوگوں کو الجھن یہ تھی کہ نماز کے ہوتے ہوئے مراقبہ کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر ایک ہی جواب کی تکرار کہ مراقبہ یکسوئی کو کہتے ہیں۔ آپ کے یکسوئی حاصل ہو گئی تو آپ مراقبے میں ہیں۔ آپ نماز پڑھیں اگر یکسوئی ہے، تو نماز ہی مراقبہ ہے۔ آپ کا دھیان بٹا ہوا ہے تو آپ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ آپ کی توجہ کام پر مرکوز نہ ہو تو آپ وہ کام اول تو کر ہی نہیں سکتے اور اگر آپ خود کو ماہر مانتے ہوئے اس کو کر بھی لیں، تو وہ ٹھیک طرح سے نہیں ہو سکتا۔ اس میں کوئی نہ کوئی کمی یا خامی رہ جائے گی۔ توجہ کا ایک نکتہ پر مرکوز ہونا ہی مراقبہ ہے۔ آپ اس کی الگ سے مشق اس لئے کرتے ہیں تا کہ

کام کے دوران اس کی افادیت سے بہرہ مند ہوسکیں۔ آپ یہ مشق اس لئے نہیں کرتے کہ اصل کام کرنا ہی چھوڑ دیں۔ کچھ کو سمجھ آئی، کچھ کو نہیں۔ اکثر لوگوں کے ذہن میں پڑی گرہیں معاشرے میں پھیلے معتقد کے طفیل اتنی کسی ہوئی ہوتی ہیں، کہ ان کو کھلنے میں وقت لگتا ہے۔

آپ نماز مغرب کے بعد انفرادی مسائل کے حل اور علاج معالجے میں مصروف ہوگئے، ہم آئے ہوئے لوگوں سے ملنے ملانے میں اور اراکین مراقبہ ہال رات کے کھانے کا انتظام کرنے میں۔

رات کھانے کے بعد لوگ رخصت ہوتے چلے گئے۔ حاجی صاحب نے انتظام یہ فرمایا کہ ابا حضور کے ہمراہ چار پانچ افراد کو لے کر وہ میر پور میں ایک سیرگاہ چلے آئے۔ اس کا مقصد ان کے ذہن میں یہی رہا ہوگا، کہ حضور مرشد کریم صبح سے مصروف رہے ہیں، کچھ چہل قدمی ہو جائے گی، کچھ سیر ہو جائے گی، اس ادا کو سب نے بہت سراہا۔ حاجی صاحب میں یہ خوبی ہے کہ وہ پس منظر میں رہتے ہوئے، پیش منظر کو سنوارنے نکھارنے میں لگے رہتے ہیں۔

چاندنی رات میں پارک میں داخل ہوئے، گیٹ سے داخل ہوکر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے۔ راستے میں دو رویہ پھولوں کے تختے۔ ہم وہاں داخل ہوئے، تو حضور

آ گئے تھے ۔ فضا میں یکدم پھولوں کی ملی جلی خوشبو پھیل گئی ۔ موتیے کی مہک سب پر بھاری تھی ۔ یوں لگا پھولوں نے میرے مراد کے استقبال کو اپنی خوشبو پھیلا دی ۔ اوپر جا کر پورا شہر نظر آیا ۔ دور دور تک پہاڑیوں پر روشنیاں بکھری دیکھ کر زمین پر تاروں بھرے آسمان کا خیال آیا ۔ کچھ دیر تک اس منظر کا لطف لیا ۔ ہوا بالکل ساکت تھی ۔ چاند ابھی افق سے زیادہ دور نہیں ابھرا تھا ۔ پارک میں آگے دور تک اتر ائی ہی اترائی تھی ۔

تازہ کرتی چلی گئی ۔ میں نے اپنے مراد کی طرف دیکھا، وہاں وہی پرسکون مسکراہٹ دیکھ کر میرے جی میں آیا کہ میں کچھ کہوں مگر نہ جانے کیوں ہمت نہ کر سکا ۔
کچھ دیر بیٹھے پھر اٹھ کر واپسی کے لئے چل دیئے ۔ واپس جاتے

صبح ناشتے سے فارغ ہو لئے تو لوگ ملنے آنا شروع ہو گئے، راولپنڈی سے شریف صاحب اپنی بیگم اور بیٹی کے ہمراہ صبح سویرے پہنچ گئے، وہ لا کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، کہ قاضی مقصود صاحب اور عثمان صاحب بھی آن پہنچے ۔ قاضی صاحب راولپنڈی مراقبہ ہال کے نگران ہیں، ان کی آمد پر مجھے لگا، اب جلد واپسی ہوگی ۔ کشمیر سے واپسی کے تاثرات مرتب ہونا شروع ہو گئے ۔ کچھ اداسی سی آگئی ۔ وہاں رہنے سے کچھ انسیت سی ہو گئی تھی ۔ میں مراقبہ ہال کے ایک کونے میں گیا ۔ واپسی کے سفر کا آغاز ہونے کو تھا ۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ اپنے مراد کے اتنا قریب نہ رہ سکے گا، جتنا اتنے روز سے رہ رہا تھا ۔ قاضی مقصود صاحب اس اپنے اور مرشد کریم کے درمیان آڑے آتے لگے ۔ میں نے سوچا کہ میرا مراد مجھے چھوڑ رہا ہے۔ میں کیا کروں، ایسے کرتا ہوں کہ یہیں رہ جاتا ہوں، حضور پنڈی چلے جائیں گے، وہاں بھی تو دور دور سے ہی دیکھوں گا، شاید وہ بھی نہ ہو کہ شاید قاضی صاحب حضور کو اپنے گھر ہی لے جائیں ۔ دو

تین دن بعد جب حضور کا پروگرام پشاور جانے کا ہوگا، تو میں پنڈی جا کر حضور کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا، ابھی مرید انہی اندیشہ ہائے دور دراز میں گرفتار خود سے الجھ رہا تھا، ممتاز علی اس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ سے بے خبر اس سے دریافت کر رہے تھے، ہم کس گاڑی میں بیٹھیں گیں، ہم سامان کہاں رکھیں گے۔ وہ انہیں کیا جواب دیتا یہی کہہ کر رہ گیا کہ دیکھیں حضور کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ فی الحال انتظار کریں۔ کہنے کو تو انتظار کا کہہ رہا تھا مگر انتظار اس سے ہو نہیں پا رہا تھا، قاضی صاحب نے اعلان کر دیا کہ ابا ان کی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر لیٹ کر جائیں گے اور کوئی دوسرا گاڑی میں نہیں بیٹھے گا، میرے خدشے پھن کاڑھ کر سامنے آنا شروع ہو گئے۔

کچھ دیر بعد پیر امراؤ کھلکھلاتی مسکراہٹیں بکھیرتا اپنے کمرے سے باہر آیا۔''

کیوں مقصود صاحب آپ تو کہیں رہ رہے ہیں نا؟'' مرید نے مرشد کی آنکھوں میں اپنے لئے نمی دیکھی وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ یہ اس کے اندر ہونے والی ڈیبیٹ (Debate) پر طنز کر رہے ہیں، اس کی کمزوریوں کا خاکہ اڑا رہے ہیں، قاضی صاحب کے بارے میں حذبہ رقابت پر ڈانٹ رہے ہیں، اس نے ڈھٹائی سے دانت کوستے ہوئے کہا۔'' جی حضور اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو۔۔۔؟'' مسکراہٹ کو قدرے سمیٹتے ہوئے فرمایا۔''

آپ قاضی صاحب کے ہمراہ بیٹھیں۔'' جی؟ اب وہ کیا کہتا اس کے پاس کہنے کو رہ ہی

کیا گیا تھا، انہوں نے اسے کچھ کہنے کے قابل چھوڑا ہی کہاں تھا۔ قاضی صاحب بھی شاید اس جھٹکے کے لئے تیار نہ تھے۔

آپ یہ کہہ کر مسکراتے ہوئے، مراقبہ ہال کے گیٹ سے گزر کر باہر کھڑی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے۔ ممتاز علی اور میں قاضی صاحب اور عثمان صاحب کے ہمراہ ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ روانہ ہوئے ہی تھے، کہ ہم سے اگلی گاڑی کو ایک صاحب نے ہاتھ دے کر رکوایا اور ابا سے ملا، ان کے پیر چھوئے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ قاضی صاحب جز بز ہو رہے تھے۔ ''ان کو پتہ بھی ہے کہ ابا کو ایسی حرکتیں پسند نہیں، یہ پھر بھی باز نہیں آتے'' ''مگر آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ ابا اس کے باوجود ان کو برداشت بھی کرتے ہیں۔'' ممتاز علی نے کہہ کر میری طرف دیکھا۔ مرشد کریم والی گاڑی روانہ ہوئی، تو ان صاحب نے ہماری گاڑی کے اندر دیکھا اور ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کر کے پچھلا دروازہ کھول کر ممتاز علی اور مجھ سے ملے۔ ارے یہ تو وہی صاحب ہیں جو گزشتہ رات ابا کو دبا رہے تھے۔ میں قاضی صاحب کے ڈر سے نیچے نہیں اترا اور گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ان سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو لیا۔ انہوں نے دعا کی فرمائش کی اور دعائیں دیں۔ ہمارے پیچھے پیچھے شفیق صاحب اپنی وین میں آ رہے تھے۔ چار، پانچ گاڑیوں کا یہ مختصر سا قافلہ اپنے مرشد کی سربراہی میں اب ایک نئی منزل کی طرف روانہ تھا۔

’’حاجی ادریس صاحب بہت اچھے میزبان اور بہت اچھے انچارج ہیں۔‘‘
ممتاز علی صاحب نے تبصرہ کیا۔ قاضی صاحب نے ہوں، کہہ کر عثمان صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرائیو کر رہے تھے۔ ہم اس گاڑی کو اپنی نگاہوں میں بسائے، بیٹھے سفر کر رہے تھے، جس میں ہمارا مراد ہمارا مرشد بیٹھا ہوا تھا۔ گاڑی سڑک پر پھسلتی جارہی تھی۔ جب بھی سڑک کے کنارے اگی ہوئی، کسی جھاڑی کے پاس سے گزرتی ہوا کے دباؤ سے وہ جھاڑی سڑک کی طرف جھکتی، ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے پودے گزرنے والی ہستی کی تعظیم میں کورنش بجالا رہے ہوں۔
سیر پور خاص پہنچ کر ہم سے اگلی گاڑی ایک گھر میں داخل ہوگئی۔ اچھا خاصا وسیع وعریض سا گھر تھا۔ ’’یہ کس کا گھر ہے؟‘‘ ’’کوئی ڈپٹی سیکرٹری صاحب ہیں۔ ان کے والد صاحب آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں۔‘‘ کسی نے مطلع کیا۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر ایک صاحب نفیس واسکٹ سوٹ میں ملبوس استقبال کر رہے تھے۔ ڈرائنگ روم بھر گیا، میں نے انہیں دیکھ کر سوچا انہیں تو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ میں نے حاجی ادریس صاحب سے پوچھا کہ یہ صاحب مجھے مانوس سے لگ رہے ہیں، انہیں میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا، وہ ہنس پڑے۔ ابھی اس دن تو آپ باورچی خانے میں بیٹھے ان صاحب سے باتیں کر رہے تھے، یہ شوکت صاحب ہیں، شوکت مجید

صاحب، ڈپٹی سیکرٹری، یہ فقیر منش آدمی کے بھی کتنے روپ ہوتے ہیں، ایک بیوروکریٹ کا یہ روپ بھی ہوسکتا ہے وہ مرشد کریم کو اپنے گھر میں دیکھ کر جس طرح سے نہال ہو رہے تھے، وہ قابل دید تھا۔ مرشد کریم گھر میں اندر زنان خانے میں چلے گئے، ہم نے آزادی سے پر تکلف چائے کو بالکلفی سے اڑایا۔ قاضی صاحب بار بار گھڑی کو دیکھ اور دکھا رہے تھے۔ دیر ہورہی ہے۔ دیر ہو جائے گی، انہیں اندر سے فارغ کریں۔ جلدی کریں، ہم ان کی بے تابی کو سمجھ رہے تھے، وہ آنے والا ہر لمحہ مرشد کے قرب میں گزارنے کے آرزو مند تھے، اور اس میں انہیں کسی اور کی شرکت بھی گوارا نہ تھی، یہ بات سمجھ آنے پر خود ہمارے اندر سکون اتر گیا۔ اب انہیں بھی موقعہ ملنا چاہیے، اب ان کی باری تھی ان کی فیڈنگ (Feeding) کے دوران ہمیں مخل ہونے کا کوئی حق نہیں تھا، جب وہ ہماری تنہائیوں میں مخل نہیں ہوئے تھے، تو ہمیں بھی ان کی خلوت کا لحاظ ہوا چاہیے تھا۔ میں ان سوچوں میں غلطاں قاضی صاحب کی دیکھ رہا تھا کہ انہوں نے مجھے آنکھ ماری۔ وہ کچھ کہہ رہے تھے۔ کوئی جملہ کہہ کر انہوں نے آنکھ ماری تھی، میں نے جملہ تو سنا نہیں۔ آنکھ مارنے پر البتہ چونک سا گیا۔ کیا قاضی صاحب بھی سمجھ گئے ہیں کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ ارے نہیں بھئی، یہ تو اتفاق ہی رہا ہوگا، میں نے خود کو تسلی دی۔

مرشد کریم نے سب سے الوداعی ملاقات کی، ہمارا سامان قاضی صاحب کی

گاڑی سے شفیق صاحب کی گاڑی میں منتقل ہوگیا۔ مرشد کریم قاضی صاحب کی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے۔ میں اور ممتاز علی شفیق صاحب کی گاڑی میں۔ ایک، دو بھائی جو پنڈی مراقبہ ہال سے متعلق تھے، وہ بھی اسی گاڑی میں آ گئے تھے۔ راستے میں شفیق صاحب سے یکدم ہی جملے بازی شروع ہوگئی، وہ عجیب باغ و بہاری طبیعت رکھتے ہیں، ان کی بیگم اور ان کی بیٹی حمرہ شفیق نے شفیق صاحب سے ہماری بے تکلفی کا برا نہیں منایا تو ہمارے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔ راستے بھر ان سے خوب زوردار چونچیں ہوئیں۔ شفیق صاحب نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ ہم آج پہلی بار ملے ہیں۔ یوں جملے بازی ہو رہی تھی، جیسے ہم لنگوٹئے رہے ہوں۔ کھانا راستے میں ایک ہوٹل میں کھایا۔ اگلی گاڑی بمع مرشد کریم دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ قاضی صاحب موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے، مرشد کریم کو لے کر تیزی سے غائب ہو چکے تھے۔

****

شفیق صاحب ہمیں پنڈی مراقبہ ہال کی بجائے اسلام آباد اپنے گھر لے گئے۔ سکول روڈ پر کافی بڑا اور کھلا سا گھر تھا۔ گھر کے سامنے لان اور پیچھے سبزیوں کی کیاریاں، ایک دو کمروں کی انیکسی۔ گھر میں خرگوش دیکھ کر مجھے شفیق صاحب کے اندر کے دیہاتی کا دھیان آیا۔ وہ ہمیں مرشد کریم سے اپنے ملنے کا واقعہ سنا رہے تھے، انہوں نے ایک دنیا دیکھ رکھی تھی، مگر اتنی دنیا دیکھ کر بھی وہ اندر سے وہی سیدھے سادے دیہاتی آدمی تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ ہمیں اپنے بیٹے کی وفات کا بتا رہی تھیں، کس طرح وہ گھر سے نہانے کے لئے گیا، اور واپس نہیں آیا۔ میرے ذہن میں یہی گزرا کہ وہ نہا کر تتلیوں کے پیچھے دور نکل گیا ہے۔ حمرہ، ان کی بیٹی قدرے توتلی سی زبان میں اپنے ابو کے ساتھ بے تکلفی سے جملے بازی کرتی اور ہمیں داد طلب نظروں سے دیکھتی۔ مجھ سے کہنے لگی، ''میرے ابو کے بہت کم دوست ہیں۔ آپ انہیں اچھے لگے ہیں۔'' پھر لان میں بیٹھ کر چائے پی گئی۔

چائے کے دوران میں نے نصیرہ سے مرشد کریم کی بابت پوچھا کہنے لگی، ''
ہمارے ابا جی بہت کیوٹ (Cute) سے ہیں۔ انہیں دیکھیں تو دل کرتا ہے دیکھتے ہی رہیں۔ سو سویٹ ہی از، (So Sweet he is) کیوں ہے نا؟ اور پھر ہنس پڑی۔ ان کی امی نے ان کی رائے پر صاد کیا۔

رات پنڈی مراقبہ ہال میں بسر ہوئی، مرشد کریم قاضی صاحب کے گھر رہے۔ صبح نماز کے وقت تشریف لائے۔ باجماعت نماز کی امامت مرشد کریم نے خود فرمائی۔ صبح کے وقت ان کی مدھر آواز میں تلاوت ساعتوں کے پتھروں پر پہاڑی جھرنوں کے ترنم اور ندی نالوں کی طرح بہتی ہوئی قلب و روح کو سیراب کرتی رہی۔ نماز کے بعد مراقبہ ہوا۔ مراقبہ کے بعد حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

'' اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اسی طرح پیدا کیا ہے جس طرح دوسری مخلوق پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کے تمام اعمال اور حرکات میں انسان کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہم عمر کے تعین کے لحاظ سے بھی انسان کو ممتاز قرار نہیں دے سکتے۔ اگر ماں باپ کی شفقت کے حوالے دیکھیں تو سب ہی جانور اپنی اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں۔ انسان کو اگر کوئی فضیلت حاصل ہے تو وہ صرف شعوری ارتقاء کے حوالے سے ہے۔ انسان کے علاوہ کسی اور جانور میں ہمیں شعوری ارتقاء نظر نہیں آتا۔ بکری آج سے لاکھوں سال

پہلے بھی پتے کھاتی تھی، آج بھی وہ پتے کھاتی ہے، اسے گھر کی ضرورت تب بھی نہ تھی اور آج بھی اسے گھر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ۔"

"انسان اور دوسری مخلوق میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ انسان میں بار بار تبدیلی آتی ہے۔ کسی کیڑے، کسی پرندے، کسی جانور کی زندگی میں کوئی تغیر نہیں ہوتا ۔ جانوروں بلکہ انسان کے علاوہ جتنی بھی مخلوقات ہیں، ان کے شعور منجمد ہیں ۔ ان کے شعور کا دائرہ کار معین ہے ۔ وہ آپس میں لڑتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، شادی بیاہ اور اولاد کی خواہش کرتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ ان کے اندر شعوری ارتقاء نہیں ہے ۔"

"خیالات کی رو دماغ پر مسلسل اور متواتر پڑتی رہتی ہے ۔ آدمی چاہے یا نہ چاہے یہ خیالات نازل ہوتے رہتے ہیں ۔ کچھ خیالات زندگی کو چلانے کے لئے اور کچھ خیالات زندگی کو آگے بڑھانے اور سدھارنے کے لئے ہوتے ہیں، اسی کو ارتقاء کہتے ہیں ۔"

"خیالات کی قبولیت یا خیالات کو رد کرنا، یہ دو صلاحیتیں ہیں ۔ انسان کے علاوہ دوسری مخلوق میں رد کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی یعنی انسان کے دماغ میں ایسا ریسیونگ سیٹ (Receiving Set) لگا ہوا ہے کہ وہ موصولہ اطلاعات میں الگ

سے ہٹ کر بھی معنی پہنا سکتا ہے۔ یہ معنی پہنانا علم کی حیثیت رکھتا ہے یعنی انسان انفارمیشن کو قبول کر کے ان میں معنی پہناتا ہے۔ اب اگر اطلاع میں معنی پہنانے والی ایجنسی محدود ہے تو وہ محدود دائرے میں سفر کرے گا، اور اگر انفارمیشن کو انسان قبول کر کے گہرائی میں داخل ہوگا، تو لامحدودیت میں سفر کرے گا۔"

"آسمانی مخلوق میں فرشتوں کی حیثیت ایک روبوٹ سے زیادہ نہیں ہے ان کی اپنی کوئی رائے کوئی مرضی یا کوئی اختیار نہیں۔ جب انسان زمینی شعور سے نکل کر آسمانی شعور میں داخل ہو جاتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اطلاع میں معنی پہنانے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس ہی لئے اسے شعوری ارتقاء کی بناء پر فرشتوں پر بھی برتری اور فضیلت حاصل ہے۔ آدم کی اسی علمی حیثیت کی بناء پر آدم کو فرشتوں سے سجدہ کروایا گیا۔"

"انسان کو معنی پہنانے کا علم یعنی اسماء کی صفات میں معانی پہنانے کا علم دیا گیا تھا۔ اللہ ایک ایسی ہستی جو قادر مطلق ہے، پوری کائنات پر کنٹرول رکھنے والی ذات، ہر مخلوق کے لئے ایک دائرہ ہے۔ ایک ایسا دائرہ جو ہر طرف سے محیط ہے۔ مخلوق اس دائرے سے نکلنے کا تصور ہی نہیں کر سکتی۔ اس بات کا علم ہونا۔ اس کا علم رکھنا آدم کی فضیلت ہے۔ یعنی آدمی میں اللہ نے ایک ایسا شعور رکھ دیا ہے جو گہرائی میں جا کر نئی نئی

باتیں معلوم کرسکتا ہے، ایجادات کرسکتا ہے۔"

فرمایا "اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان میں اس کو زمینی اور آسمانی مخلوق سے ممتاز کرنے والی صفت ہے، اور وہ صفت یہ ہے کہ وہ انفارمیشن قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو رد کرنے والی ایجنسی بھی رکھتا ہے۔"

آدم کی اولاد بھی آدم ہے۔ آدم کی موجودہ پیدائش نسلی اعتبار سے زمینی شعور کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی محدودیت میں رہ کر وسائل استعمال کرتی ہے۔ اور دنیاوی معاملات اس کی تمام تر توجہ جذب کئے رہتے ہیں۔ پھر آدمی جنت میں نافرمانی کا مرتکب ہوکر ہی اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ہر آدمی آدم ہے اور ہر لڑکی حوا۔ جب تک آدمی جنت میں غلطی کا مرتکب نہیں ہوتا، وہ دنیا میں نہیں آتا۔"

دنیا میں آکر اگر انسان نے خود کو محدود کرلیا تو وہ جانوروں سے بھی کم تر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اگر وہ حیوانات سے ممتاز ہونا چاہتا ہے تو اس کے اندر رہبر وہ صلاحیت موجود ہونا چاہیے جو زمینی اور آسمانی مخلوق میں موجود نہیں۔ اپنی تخلیق کے مقصد کو پانے کے لئے ہمارے پاس صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہم خود کو اس شعور سے آراستہ کرلیں جو انبیاء کا شعور ہے، جو انبیاء کے وارث اولیاء کرام کا شعور ہے۔"

خطاب کے بعد لوگوں نے حضور سے ملنا شروع کردیا۔ ملاقات کے لئے

آنے والے لوگوں کے ہجوم کے پیشِ نظر قاضی صاحب نے چیدہ چیدہ افراد کو ہی ملاقات کی اجازت دی اور ادھر ناشتہ لگوا دیا کہ لوگ ناشتے کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ ان کی یہ حکمتِ عملی بہت حد تک کارگر رہی۔

ناشتے کے بعد انہوں نے مرشد کریم کے بیٹھنے کو باہر صحن میں ایک طرف انتظام کر کے لوگوں کو باری باری ان کے پاس بھجوانے کا اہتمام کیا۔ اس دوران عقیدت کے، ضرورت کے، پریشانی کے، جلد بازی کے، گھبراہٹ کے، طلب کے، بیماری کے، عجیب عجیب چہرے دیکھنے کو آتے رہے۔ ایک معمر آدمی ڈیوٹی پر کھڑے صاحب سے عجیب سے لہجے میں دہائی دیتے ہوئے پنجابی میں کہہ رہا تھا: ''مجھے ان کو صرف ایک نظر دیکھ لینے دو۔ میں بہت دور سے آیا ہوں۔ میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ڈیوٹی پر کھڑے صاحب ان سے ایک ہی بات کہے جا رہے تھے۔ ''ذرا صبر کریں، آپ سے پہلے آئے ہوئے لوگوں کا بھی کچھ حق بنتا ہے۔''

حق بننے کی بات پر مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ لوگوں کے حق کے مقابل تو بندے کا فرض ہی ہوتا ہے۔ حق کی طلب کے مقابل فرض کی ادائیگی پر توجہ دی جائے تو زندگی کی راہوں میں انقلاب آ جاتا ہے، فقیر اپنے سارے حقوق سے دستبردار ہو کر فرائض کی ادائیگی میں منہمک ہو جاتا ہے۔ لوگوں کے ذمے اس کے کیا کیا حقوق بنتے ہیں، اس کی

طرف اس کی نظر جاتی بھی ہوگی تو وہ اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا کہ اس پر اس وقت کیا بیتتی ہے جب لوگ اس کے حقوق کی نہیں، اپنے فرائض کی نہیں، اپنے حقوق کی اور اس کے فرائض کی بات کرتے ہیں۔ وہ اپنے حقوق اللہ سے وابستہ کئے، اپنے فرائض میں منہمک رہتا ہے۔ اس کے انہماک کو اس بندے کی فریادی پکار بھی ڈسٹرب نہ کر پا رہی تھی کہ ''ہٹ جاؤ مجھے اس کو صرف ایک نظر دیکھ لینے دو۔'' میں دیکھا کہ مرشد کریم نے بظاہر کوئی ایسا تاثر نہ دیا جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ اس بات کو سن بھی رہے ہیں وہ جو ذہن میں چھپی باتوں تک کو جاننے کی قدرت رکھتے ہیں بعض اوقات اتنے انجان سے بن جاتے ہیں جیسے انہیں اپنے اردگرد ہونے والی باتوں کا کوئی علم ہی نہیں۔ اس وقت بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔

وہ ایک مریض کو دیکھنے میں پوری طرح منہمک تھے۔ ان کی توجہ کا دائرہ صرف اسی ایک مریض کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ اس وقت ان کی توجہ صرف اس مریض پر مبذول تھی جو ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ صاحب خود ہی ٹھنڈے سے پڑ گئے اور پیچھے کھسک کر لائن میں سب سے پیچھے کی طرف چلے گئے۔ کہاں تو یہ جوش و خروش اور کہاں یہ پسپائی۔ مجھے آج اکثر باتیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔

قاضی صاحب اپنی انتظامی سرگرمیوں میں جتے ہوئے تھے۔ ایک صاحب

نے میرے مراد سے اپنے یہاں آنے کو مدعو کرتے ہوئے کہا آپ کچھ وقت ہمارے لئے بھی تو نکالیں۔ اس پر بڑے دھیمے لہجے میں مسکراتے ہوئے فرمایا ''بھئی اب میں بڑا آدمی بن گیا ہوں، شیڈول کے بغیر نہیں چلتا۔ آپ قاضی صاحب سے بات کرلیں۔'' کہنے میں کچھ ایسی بات تھی کہ سب ہی ہنس پڑے۔

مردوں کے بعد خواتین کو دیکھنے اور ان کے مسائل کے حل کا آغاز ہوا۔ یہ سلسلہ تقریباً گیارہ بجے تک چلتا رہا۔ مریض ختم ہو گئے تو سلسلے کے بھائی بہنوں نے ملنا شروع کر دیا۔ وہ سب آکر ادب سے خاموشی سے گھیرا ڈال کر نیم دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔ ایک صاحب نے لطائف کی بابت سوال پوچھا۔ ان کے سوال کے جواب میں فرمایا۔ ''دراصل صعودی اور نزولی حرکات ہی لطائف ہیں۔ لاشعوری تحریکات کو وضاحت سے پورے طور پر وصول کر لینا ہی لطائف کی رنگینی کہلاتی ہے۔ پیر و مرشد شعور کے بعد لاشعور کے قریب ہونے کی بات کو ان لطائف ہی کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔ پیر و مرشد یعنی روحانی استاد دراصل مرید یعنی روحانی طالب علم کے لطیفہ نفسی کو رنگین کرتا ہے۔ اس کی اتنی صفائی کرتا ہے کہ وہ مینتل ہو جائے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو جو کچھ بھی سامنے آئے گا اس میں آمیزش ہوگی۔ اگر لطیفہ نفسی کے رنگین ہونے سے پہلے قلبی لطیفہ رنگین ہو جائے یعنی اس کی تحریکات شروع ہو جائیں تو آدمی شیطان کو فرشتہ دیکھتا ہے۔ اس کی مثال غلام

احمد قادیانی ہے۔وہ بھی شیطان کو فرشتہ سمجھتا رہا۔''

یہ بھی فرمایا کہ نزولی کیفیت میں ذات کا عرفان ہوتا ہے جبکہ صعودی میں صفات کا۔ پھر اس بات کی وضاحت کو پھول کی مثال دی اور فرمایا کہ پھول کا ادراک ہوا کہ یہ گلاب ہے۔ پھول کی ذات کا ادراک ہوا اور یہ کہ اس پھول کا رنگ سرخ ہے۔ اس کی خوشبو ایسی ہے، اس میں کانٹے ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔ تو یہ سب صفات کا عرفان ہوا۔

پھر بتایا'' جب بچہ دنیا میں آتا ہے تو اس کا لاشعور پردے میں چلا جاتا ہے۔ بیس سال تک دھول پڑتی رہتی ہے۔ پردہ پوری طرح لاشعور کو اپنی اوٹ میں لے لیتا ہے۔ اسی دھول کی صفائی کرنا مرشد کا کام ہوتا ہے۔ اگر یہ صفائی یکدم کر دی جائے تو انسان یکدم بچے کی حالت میں واپس چلا جاتا ہے۔ یہ صورت جذب کہلاتی ہے اور اگر یہی صفائی بتدریج اور آہستہ آہستہ کر کے اس پردے کو باریک جالی کی مانند کر دیا جائے تو یہ عمل روحانی ترقی کہلاتا ہے۔ اس پردے کو بالکل ختم کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ اس پردے کو باریک جالی کی مانند بنا دیا جاتا ہے تاکہ لاشعور اس پردے میں سے جھلکتا رہے فلٹر ہو کر آتا رہے۔''

کسی نے کوئی بات دریافت کی تو اس کے جواب میں ارشاد فرمایا'' ہمیں میزبانی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف حاصل ہے۔ ہم حضرت ایوب انصاری کی اولاد

ہیں۔ ابو ب انصاری بہت امیر آدمی تھے۔ اگر غریب آدمی ہوتے تو حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کی میزبانی تو نہ کر سکتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کی اس میزبانی کا ہمیشہ بہت خیال رہا۔ میرے بھائی مولانا ادریس انصاری نے یہ بات زور دے کر کہی تھی کہ آپ اپنے سلسلے میں اس بات کو ضرور چھوڑ جائیں کہ آپ انصاری ہیں اور آپ کی نسل حضرت ابو ب انصاری سے ہے۔ بھئی یہ کوئی معمولی سعادت تو نہیں۔ لیکن یہ تو اس سلسلے کی برکت ہے کہ اب تو اپنے عظیمی ہونے پر ہی فخر ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری نے تین سال تک میزبانی رسول ﷺ کی۔ بھئی اونٹنی کسی غریب کے گھر کے سامنے جا کر رکتی تو وہ اپنے گھر کا خرچ چلاتا یا رسول کریمؐ کی میزبانی کرتا۔''

پھر میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے پاس ایک کتاب ہے۔ ''وہ کتاب انڈیا سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں انصاری خاندان کا شجرہ ہے۔ اس کتاب میں ایک ایسی تصویر بھی شائع ہوئی ہے جس میں میں اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ کھڑا ہوں۔ میاں صاحب نے تو اپنی ایک کتاب میں بھی اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ میں ابو ب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہوں۔''

مجھ سے پشاور سے کراچی پرواز کی بابت دریافت کیا کہ اس کا انتظام ہو گیا ہے یا نہیں میں عرض کی ابھی پوچھ کر آتا ہوں۔ میں نے پشاور ٹیلی فون کر کے زبیر عزیز

صاحب سے ٹکٹ کی بابت پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ فلاں تاریخ میں ایرو ایشیاء پر حضور کے لئے سیٹ بک ہوگئی ہے۔ ممتاز علی صاحب ان کے ہمراہ جائیں گے۔ میں نے واپس آکر عرض کی۔ ''حضور آپ کی اور ممتاز بھائی کی سیٹیں بک ہوگئی ہیں۔''

آپ نے پوچھا ''کس تاریخ کو؟'' میں نے تاریخ عرض کی۔ دریافت کیا ''کس وقت؟'' اور اب یہ عجیب سی بات ہے کہ مجھے نہ تو پوچھنا یاد رہا اور نہ ہی یہ یاد آ رہا تھا کہ ایرو ایشیاء کی پرواز کس وقت ہوتی ہے۔ حالانکہ میں خود اس پرواز سے کئی بار کراچی جا چکا تھا۔ صبح گیارہ بجے تھی یا سہ پہر چار بجے۔ بہت زور دینے پر بھی جب یاد نہ کر سکا تو بے بسی سے مرشد کریم کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک سکون آمیز مسکراہٹ کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ عرض کی ''حضور خیال ہی نہیں آیا کہ یہ بھی پوچھنا چاہیے تھا۔''

فرمایا۔ ''موت دھیان سے اتر رہی ہے؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دریافت کیا کہ اس کا کیا مطلب ہوا تو فرمایا۔ ''اگر پتہ چلے کہ دس روز بعد مرنا ہے تو ذہن میں آتا ہے کہ ابھی کیوں نہ مر جائیں۔'' ایک طرح سے یہ بھی یکسوئی ہی ہوئی، میں نے خود کو تسلی دی۔

شام کو روز گارڈن اسلام آباد گئے۔ قاضی صاحب نے وہاں پکنک نما پارٹی کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ راولپنڈی کے بھائیوں نے مراقبہ ہال کے لئے زمین خریدی تھی

پارٹی پکنک پہ اسی خوشی میں تھی۔ وہاں ادھر ادھر گھومتے، روشوں کے کناروں پر لگے پھولوں کو سراہتے رہے۔ فوارے کے گرد کھڑے ہو کر اس کے پانی کو اوپر سے نیچے آتا دیکھتے رہے۔ پارک میں بنے راستوں پہ لگی سیمنٹ کی اینٹوں کو محسوس کئے بغیر ان پر چلتے پھرتے سرسبز گھاس کے وسیع قطعات سے لطف اندوز ہوتے سب بہن بھائی مرشد کریم کے گرد جمع تھے۔

پارک میں پھولوں کے ایک کنج کے پاس ایک دری بچھا دی گئی۔ دری پہ میرا مراد رونق افروز ہوا۔ پھولوں کی خوشبو کا احساس فضا میں بکھرا ہوا تھا۔ کنج میں گلاب ہی گلاب تھے۔ کسی نے تکیہ لا کر دیا کہ اس کے ساتھ ٹیک لگا لیں۔ فرمایا ''لوگ فقیر کو نہ جانے تکیہ کیوں دیتے ہیں۔'' پھر نہایت بھولپن سے انداز میں کہا ''شاید لوگ دیکھ نہیں سکتے کہ یہ اللہ کے سہارے کیوں بیٹھا ہوا ہے۔'' پارک کی وسعت پارک کی بناوٹ وہاں لگے درختوں پر تبصروں سے ہوتے ہوئے بات پنڈی مراقبہ ہال کی زمین پر آن پہنچی۔ مرشد کریم نے زمین کی بابت پوچھا۔ ارد گرد کے لوگوں کی بابت دریافت کیا۔ پانی، بجلی، سڑک کی بابت پوچھ کر قیمت وغیرہ کی بات کی اور پھر جیب سے کچھ رقم شاید پانچ ہزار روپے نکال کر قاضی صاحب کو دیئے کہ یہ میرے طرف سے زمین کے لئے۔ قاضی صاحب نے رقم محمد بوٹا صاحب کو دی کہ یہ سارا انتظام انہی کے سپرد تھا۔ وہاں موجود

بہن بھائیوں نے حسب استطاعت حصہ لینا شروع کیا کچھ نے وعدہ کیا اور کچھ نے حصہ لینے کا اعلان ۔مٹھائی بٹی، پکنک کا آغاز ہوا۔

مرشد کریم نے یہ دیکھ کر کہ لوگ پارک میں آکر بھی پارک کو نہیں دیکھ رہے تو انہیں حکماً پارک دیکھنے کا کہا۔''آپ مجھے چھوڑ کر ادھر ادھر بھی دیکھیں، گھومیں پھریں'' یکدم سب ہٹ گئے ۔ہٹنے کے باوجود سب کی توجہ کا مرکز مرشد کریم ہی تھے ۔ایک جگہ جمگھٹا کئے ہوئے لوگ قدرے بکھر گئے ۔مگر دور سے دیکھنے پر صاف معلوم ہوتا تھا کہ سب کس مرکز سے بندھے ہوئے ہیں ۔گھیرا ٹوٹا نہیں، بکھرا بھی نہیں فقط کھل گیا تھا۔

بچوں کے دل پسند مشروب کوک اور پیپسی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ساتھ میں چپس یہ تو مزے ہی آگئے ۔بچے تو کھل ہی اٹھے اور بچوں کو خوش دیکھ کر وہاں سب ہی کا سرور اور لطف دوبالا ہوتا چلا گیا ۔مرشد کریم اٹھ کر ادھر ادھر گھومتے رہے پھر ایک بنچ پر آکر بیٹھ گئے ۔بنچ پر بیٹھے سب کو دیکھ رہے تھے کہ ایک بچے نے آکر سوال کیا ۔اس سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ جو بھی حرکت شروع ہوتی ہے اس کا کوئی نہ کوئی انجام بھی ہوتا ہے ۔دنیا کا آغاز اللہ تعالیٰ نے کن کہہ کر کیا یعنی جب کن کہا تو دنیا شروع ہوگئی اور اب جب اللہ تعالیٰ ''لبد'' کہیں گے تو دنیا ختم ہو جائے گی اور ہم سب جہاں سے آئے تھے وہیں واپس چلے جائیں گے لبد کے بعد ابدالاباد میں منتقل ہو جائیں گے اور یہ ہمیشگی

کی کیفیت ہے۔ اللہ کے کن کہنے سے پہلے جیسی کیفیت جب سوائے اللہ کے اور کچھ نہیں باقی رہے گا۔ مرشد کریم کو گفتگو کرتے دیکھ کر سب قریب کھسک آئے۔ بچے کی والدہ نے بچے کے بارے میں بتایا کہ وہ اکثر کوئی نہ کوئی بات ایسی پوچھ لیتا ہے کہ وہ اس کی باتوں کا جواب دے نہیں پاتیں۔ ماشاء اللہ بہت ذہین اور پیارا سا بچہ تھا۔ حضور نے اس کی والدہ کو مشورہ دیا کہ وہ بچے کو رات سونے سے پیشتر مراقبہ کرنے دیا کریں، لیکن صرف پانچ دس منٹ اس سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ اس سے بچے کی دلچسپی اندر کی دنیا کی طرف بڑھ جائے گی اور اندر کی دنیا تو اتنی خوبصورت ہے کہ اس کے مقابلے میں باہر کی دنیا کی طرف توجہ زیادہ بوجھ لگتا ہے۔

رات کے کھانے کا اہتمام بھی وہیں پارک میں کیا گیا تھا۔ پکا ہوا کھانا لایا گیا۔ اسے گرم کیا گیا۔ رات کا سماں، کھلی فضا، آبادی کے اثرات سے دور پارک میں چلتے پھرتے لوگ، اندھیرے اور روشنیوں کے سنگم پر قرب مراد سے سرشار روحیں ماحول میں ایک دھیما پن، مرشد کریم کی قربت کا احساس، لگتا تھا ہم سب کسی اور ہی عالم میں ہیں۔ میں نے کھانے کے بعد ادھر ادھر دیکھا۔ حیرت ہوئی جس جگہ اتنے لوگوں کا ہجوم ہو وہاں آنے والوں کے قیام کے اثرات بکھری ہوئی اشیاء، لفافوں اور کاغذوں کی صورت دیکھنے میں آتے ہیں مگر وہاں ایسا کوئی نشان نہ تھا۔ سب نے پارک کی صفائی اور

حسن کے احترام میں چھلکوں اور کاغذوں کو ادھر ادھر پھیلانے سے پرہیز کر کے اپنے تہذیب یافتہ ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

ایک بار کراچی مراقبہ ہال میں مرشد کریم مراقبہ ہال سے باہر آئے۔ مسجد کی طرف جاتے ہوئے ایک جگہ رکے۔ راستے میں گرے ہوئے سگریٹ کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اپنے ساتھ جانے والے کو دکھا کر کہا" مجھے یہ چیز بہت بری لگتی ہے۔" یہ انداز تربیت تھا۔ یہ نہیں فرمایا کہ سگریٹ کے ٹوٹے یوں نہیں گرانے چاہئیں۔ اس پر کوئی لیکچر بھی نہیں دیا کہ لوگوں کو احساس نہیں۔ صرف اتنا کہہ دیا کہ یہ ایک بری بات ہے۔ ہم سب اس بات کے گواہ ہیں کہ کراچی مراقبہ ہال کے اندر ہی نہیں باہر بھی صفائی کا ایک اعلیٰ معیار قائم رہتا ہے۔ یہ حضور کی تربیت ہی کا اعجاز ہے کہ مزاج میں تربیت، سلیقہ اور صفائی بھی شامل ہوتی چلی جا رہی ہے اور اب یہاں پارک میں بھی جہاں پکنک منا کر ہم واپس جا رہے تھے۔ وہاں پر اپنی آمد کے نشان بری طرح چھوڑنے کی بجائے وہاں سے خوشگوار یادیں سمیٹ کر جا رہے تھے۔

عظمتوں کا حامل ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ انسان صرف بڑی بڑی باتیں ہی کرے، بڑے بڑے کارنامے ہی سر انجام دے اس سے آدمی ہیرو تو ضرور بن جاتا ہے۔ عظیم نہیں۔ عظیم اور بڑا بننے کے لئے بڑی بڑی باتوں کی بجائے چھوٹی چھوٹی

باتوں کو سیدھا کرنا، ان کو اچھی طرح سرانجام دینا بھی ضروری ہے۔ زندگی کو اچھی طرح بسر کرنا ہی حقیقی عظمت ہے۔ اپنے مراد کی ہمراہی میں قدم اٹھانے سے پیشتر میرے انداز فکر میں یہی تھا کہ عظمت کا تعلق بڑائی سے ہے اور بڑائی کے لئے بڑے بڑے کاموں کا کیا جانا ضروری ہے۔ لیکن اب اسے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ نہ کوئی کام بڑا ہوتا اور نہ ہی کوئی کام چھوٹا۔ ہر کام کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ ہر کام کو اچھی طرح کرنا اس کو بہ احسن وکمال سرانجام دینا ہی بڑائی ہے اور یہی حقیقی عظمت ہے۔

ممتاز علی اور میں اعجاز صاحب کے ہمراہ سہالہ روڈ پر ان کے گھر گئے۔ ان کے گھر میں روحانی لائبریری قائم دیکھ کر مجھے بہت ہی خوشگوار لگا۔ انہوں نے نہایت شوق سے اس علمی مشن کو پھیلانے کی خاطر اپنے گھر میں یہ لائبریری بنائی ہوئی تھی۔ وہ بتا رہے تھے کہ وہ خود تو زیادہ تر مصروف ہی رہتے ہیں اور ان کے بچے اور بیوی اس لائبریری کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ''گھر میں لائبریری ہونے سے بچوں نے یہ تمام کتب پڑھ لی ہیں۔ ان کے اس اطلاع دینے پر ممتاز علی نے تبصرہ کیا کہ ''یہ مرشد کریم ہی کا اعجاز ہے کہ ان بچوں میں علم کا ذوق پیدا فرما دیا ہے۔'' ملک میں کتب بینی کے ذوق کی جس طرح سے جدید دور کے تقاضوں کے نام پر بیخ کنی کی گئی ہے۔ اس ذوق کی آبیاری کرنے کو کوئی شکوہ سنج تقریریں نہیں کی گئیں۔ اخبارات میں لائبریریوں

کے قیام کی ضرورت پر کوئی لمبے چوڑے بیانات نہیں دیئے، ریڈیو ٹی وی پر کوئی مذاکرہ تک نہیں کرایا۔ نہایت سادگی سے چند دوستوں کو آمادہ کیا کہ وہ ایک جگہ لے کر وہاں بیس پچاس کتب رکھ کر لائبریری کا آغاز کر دیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اللہ اس میں کو دو ہی برکت دے گا۔ اگر کسی نے کتب کی خریداری میں اعانت طلب کی تو کاپی کتب عطیہ کر دیں یا نصف قیمت پر مہیا کروا دیں ''اندھیروں کو کوسنے سے تو یہی بہتر ہے کہ انسان ایک شمع روشن کر دے۔'' یہ ایک چینی کہاوت کا مفہوم ہے۔ یوں لگا کہ اس کی عملی صورت کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔

وہاں سے واپسی پر طبیعت میں چہل بلکہ چلبلاہٹ کی کیفیت تھی۔ راستے میں انہوں نے سڑک سے دور اندھیروں میں اشارہ کر کے بتایا کہ چنڈی مرا قبہ ہال کے لئے زمین اس جگہ پر لی گئی ہے۔ ہمیں کچھ نظر تو آیا نہیں اس خوشی میں، جو وہ محسوس کر رہے تھے وہ مان جس کے تحت وہ بات کر رہے تھے اس کو بڑھانے کو لیے ہم نے اظہار مسرت کیا کہ اب چنڈی والے اپنا مراقبہ ہال خود تعمیر کریں گے۔ تعمیری سوچوں کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان اپنے اردگرد اپنے بسنے والوں کو ہی نہیں بلکہ ملنے جلنے اور دوست احباب میں بھی ایک ذوق تعمیر ابھارے۔ وہی وقت جو انسان بہت سی باتوں کی آرزو میں گزرتے ہوئے گزار دیتا ہے کچھ تعمیر کرنے کی فکر میں گزارے تو ہر دو طرح کے

گزرے ہوئے اوقات کا موازنہ یہ سمجھانے کو بہت کافی رہتا ہے کہ دوسری صورت میں بہتری ہی بہتری ہے۔

گاڑی رکی تو ہم کتنی ہی دیر تک گاڑی ہی میں بیٹھے باتیں کرتے رہے وہ باتیں جن میں خوشگوار یادیں تھیں۔ وہ باتیں جن کو ہم نے اپنے سینوں میں سمیٹا ہوا تھا اور ایک دوسرے کو سنا کر محظوظ ہو رہے تھے۔ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اعجاز صاحب سے ہماری ملاقات محض دو تین گھنٹے پہلے ہوئی ہے۔ ان کا پیار ہمارے لئے ہوتے ہوئے بھی ہمارے لئے نہیں بلکہ ہمارے اور ان کے اپنے مراد کے لئے تھا۔ ہمیں بھی وہ اسی حوالے سے نہ تو غیر لگ رہے تھے اور نہ ہی اجنبی۔ ہمیں ہم دل اور ہم ذہن بنانے میں جس کا ہاتھ تھا، اس کا حوالہ اتنا مضبوط اور اتنا پائیدار تھا کہ ہر وہ شخص جو میرے مراد سے وابستہ تھا۔ میرے لئے نہ تو اجنبی رہا تھا اور نہ ہی غیر۔ اسی بات کو خود میرے مراد نے کچھ یوں بیان کیا تھا کہ آپ سب میری روحانی اولاد ہونے کے ناتے آپس میں بہن بھائی ہیں۔

آپ نے محبتوں کے بہت سے رنگ دیکھے ہوں گے۔ میں محبت کو ایک سیال شے کی مانند اوپر سے نیچے بہتے دیکھنے والوں میں سے ہوں۔ محبت کا دھارا ماں سے اولاد کی طرف بہتا ہے کبھی اولاد سے ماں کی طرف نہیں بہتا۔ ماں سے پیار دھتا ہے

تو وہ محض خود اس کی محبت کی کشش کا ردعمل ہی ہوتا ہے لیکن وہ ہماری ضرورت ہوتی ہے اس لئے ہمیں پیاری ہوتی ہے۔ وہ محبت جو ماں کرتی ہے بے غرض بے لوث اور بے طرح ہوتی ہے، اسی محبت میں وہ شے ہوتی ہے جس کی مثال دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اپنی محبت کو اس محبت کا ستر گنا سے زیادہ ہونا بتایا ہے۔ ماں کی محبت کو میں جب بھی ستر گنا کر کے محسوس کرنے کو کوشش کی ہے

جو رنگ ہوتا ہے اس کو گر ستر گنا سے زیادہ کر لیا جائے تو وہ کس قدر ہوگا۔ میرا ذہن اکثر اس گتھی کو مقداروں کے حوالے سے حل کرنے کی کوشش کرتا اور نا کام رہتا ہے۔ اس نا کام رہنے ہی کی بابت تو مرشد کریم نے فرمایا تھا کہ اللہ تو وہ ہے جس کے سامنے سوائے تحیر اور درماندگی کے کچھ باقی نہیں رہتا۔ میں نے اپنے مراد کو اپنی روحانی اولاد سے محبت کرتے دیکھا بھی ہے اور محسوس بھی کیا ہے۔ ان کی محبت کا دائرہ کبھی کبھی تو مجھے پھیل کر اس طرح سے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے جس طرح سے میں اپنی والدہ کی محبت اور شفقت کی لہروں کو محسوس کرتا ہوں۔ ان کی بے پایاں محبت کا موازنہ میں نے اکثر اپنے مراد کی محبت سے کرنے کی کوشش کی ہے لیکن پہلے پہل تو مجھے یہ بات ہی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کوئی شخص بغیر کسی مادی تعلق کے آپ سے اتنی محبت کیونکر کر سکتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ

بات سمجھ آئی کہ مادی تعلق تو ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ماں اپنی اولاد سے بے خبر ہو سکتی ہے۔اس کو بھول سکتی ہے۔اس سے بے پرواہ ہو سکتی ہے۔اس کا اپنی اولاد سے عالم رنگ و بو سے آگے کوئی تعلق نہیں رہتا۔وہ اپنی محبت کے ہاتھوں حسد کا شکار ہو جاتی ہے۔ساس بہو کے جھگڑے میں ساس اسی حسد کا شکار ہوتی ہے۔لیکن مراد کی محبت میں یہ بات نہیں ہوتی۔نہ تو وہ بے پرواہ رہتی ہے اور نہ ہی بھول کا شکار ہوتی ہے۔بات محسوس کرنے کی ہے۔ہم میں سے کتنے ہیں جو اللہ کی محبت کو محسوس کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں۔

محسوس کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے تو کیا تعجب۔

ایک بار میں کراچی مراقبہ ہال میں اپنے مراد کے ہمراہ بیٹھا تھا۔سلسلہ میں داخل ہوئے مجھے کچھ زیادہ مدت نہ ہوئی تھی۔میں ابھی آداب نیاز مندی تو کجا آداب محفل تک سے ناواقف تھا۔شام کا وقت تھا۔چراغ چلائے جا چکے تھے لیکن ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ہموار زمین سے قدرے بلند تھڑے پر دستر خوان بچھا ہوا تھا اس دستر خوان کے درمیان ایک گیس رکھا تھا۔مرشد کے قرب میں محسوس ہونے والی لذت سے حواس آشنا ہو رہے تھے۔میں اپنے مراد کے بائیں طرف بیٹھا ہوا تھا۔ایک خاتون تشریف لائیں۔مرشد کریم نے انہیں وہیں بلا لیا۔وہ آکر دستر خوان پر ہمارے سامنے بیٹھ گئیں۔

میں نے انہیں گیس کی سفید روشنی میں دیکھا۔ کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد کئی بار میرے نظران کی طرف اٹھی چند ایک بار ہماری نگاہیں آپس میں ٹکرائیں بھی، روشنی نے کئی پتنگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس اندھیرے میں، اس سفید روشنی میں ان کے چہرے پر کھلتی مسکراہٹ نے مجھے کئی بار اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں ادھر متوجہ ہوا تو میرے مراد کی مدھری آواز آئی۔ ”آیئے مقصود صاحب چلیں۔ یہاں تو پروانے آ گئے ہیں۔“ جوتی پہنتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ ”پروانہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ جانتا ہے جل جاؤں گا مگر باز نہیں رہ سکتا۔ پروانہ جو ہوا۔“

میں اس طرح سے کبھی خجل نہ ہوا تھا جس طرح اس روز ہوا۔ میں

کسی کو خبر ہی نہ ہو۔ میں کیا کہتا۔ کہنے کو رہا ہی کیا تھا۔ آج تک اپنی اس طرح سے اصلاح کئے جانے کا لطف لیتا ہوں اور مرشد کریم کی بے پایاں محبت کو محسوس کرتا ہوں۔

میں نے کئی بار اپنے مرشد کو یہ کہتے سنا ہے ”لوگ تو کہتے ہیں کہ سلسلے نے ہمیں کیا دیا ہے۔“ اس جملے کو کہتے ہوئے ان کو لہجے میں، ایسا کہنے والوں کی نادانی پر، تاسف کا گہرا احساس چھپا ہوتا ہے۔ ظاہر بین حضرات ہی ایسا کہنے کی جسارت کر سکتے ہیں۔ ورنہ وہ جو اپنے مراد کی گہری محبت کو ایک بار محسوس کر لے ایسا کہنا تو کجا ایسا سوچنا

بھی گوارا نہیں کر سکتا۔

صبح قاضی صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ آج مرشد کریم کا پروگرام اسلام آباد جانے کا ہے۔ آپ شفیق صاحب کے یہاں رہیں۔ ہم سب وہیں اکٹھے ہوں گے۔ شفیق صاحب تو یہ خبر سن کر نہال ہو گئے۔ ہم ان کے ہمراہ ان کے گھر آ گئے۔ وہاں وہ مرشد کریم کے استقبال کی تیاریاں کرتے رہے ہم انہیں تیاریاں کرتے دیکھتے رہے۔ چائے میں فلاں شے ہونا ضروری ہے۔ فلاں سیٹ نکالو۔ وہاں گلدان میں وہ پھول لگاؤ۔ یہ کمرہ تیار کرو۔ وہ تھوڑی دیر ہمارے پاس اکیلے بیٹھیں گے نا۔ بیگم شفیق اپنے مراد سے کچھ راز و نیاز کرنا چاہ رہی ہوں گی۔ نہ جانے کیا کیا کچھ کہنا چاہتی ہوں گی۔ اپنا کون کون سا دکھ ان کے حضور بیان کر کے خود کو ہلکا پھلکا کریں گی۔ یہاں یہ

گھرانہ اس طرح چشم براہ ہو سکتا ہے۔ میں نے ایسا کم ہی دیکھا ہے۔

شفیق صاحب کے ساتھ مارکیٹ گئے۔ کیمرے کے سیل خریدے۔ بابا جی کے لئے پھول اور ہار۔ بیکری سے کیا کیا لینا ہے۔ شفیق صاحب اپنی بیگم کی دی ہوئی لسٹ کو یاد کرتے نہ جانے کیا کیا خریدتے رہے۔ میں اور ممتاز علی ان کے اندر ان کے مراد کی محبت کی کشش سے ہونے والی اتھل پتھل کا نظارہ کرتے، ان کے ہمراہ ادھر ادھر

گھومتے پھرتے، ان کو تیار یاں کرتے، ان کے خدشات پہ ان کو تسلی دیتے رہے۔ اب انتظار تھا کہ مرشد کریم تشریف لائیں۔

ایک گاڑی آتو رہی ہے۔ وہ تو نہیں۔ اب تک انہیں پہنچ جانا چاہئے۔ قاضی صاحب پتہ نہیں انہیں کہاں کہاں لئے پھر رہے ہوں گے۔ دس سے گیارہ بج گئے۔ انتظار میں پہلے تو کوفت ہوا شروع ہوئی پھر جھنجھلاہٹ۔ شفیق صاحب کبھی اندر کبھی باہر بارہ بج گئے۔ ''یہ قاضی صاحب نے باباجی کو منع کر دیا ہوگا۔'' بیگم شفیق کے خدشات نے سر ابھارا۔ ''آپ اپنی تیاری رکھیں جب کہا گیا ہے کہ چائے آپ کے ہاں پئیں گے تو آپ فکر نہ کریں۔ ابا حضور ضرور آئیں گے۔'' ان کو تسلی دی گئی۔ ایک بج گیا۔ ''اب تو چائے پلانا غلط ہو جائے گا۔ آپ کھانے کا بندوبست فرمائیں۔'' شفیق صاحب نے اپنی بیگم سے کہا اور ہم سے رائے لی۔ ہم خود الجھ سے گئے تھے۔ قاضی صاحب کہیں سے فون ہی کر دیتے۔

ایک گاڑی آئی۔ عثمان صاحب اور قاضی صاحب تشریف لائے۔ ''باباجی کہاں ہیں؟ وہ آرہے ہیں نا؟ وہ آئیں گے نا؟ سوال در سوال کے جواب میں قاضی صاحب نے کہا کہ اب حضور چائے یہیں آکر پئیں گے۔ اس وقت تو ہم انہیں لینے آئے ہیں۔ انہیں ابا نے بلایا ہے۔'' انہیں سے ان کا اشارہ ہماری طرف تھا۔ ہم نے انتظار کی

اذیت سے نجات ملنے پر شکر کیا اور کھانا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

قاضی صاحب ہمیں لے کر جس گھر گئے وہ گھر سے زیادہ ایک محل تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے طبیعت پر ایک بوجھ سا لگا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا عمارت شاندار، آٹھ دس گاڑیوں کی گنجائش والا پورچ، وسیع و عریض لان، لان میں طرح طرح کے پھول دار پودے، بعض نایاب قسم کے پودے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ عجیب سا احساس کیا ہے۔ ہم نے اپنے مراد کے چہرے پر نظر ڈالی اور بے فکر ہو گئے۔ ہوگا کچھ۔

صاحب خانہ کا چھوٹا بھائی مرشد کریم کے عقیدت مندوں میں سے تھا اور وہ چاہتا تھا کہ مرشد کریم ایک وقت کا کھانا ان کے ہاں کھائیں۔ ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو وہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی کھانے کی میز کی طرف روانگی ہوئی۔ کھانے کی میز طرح طرح کے مرغن اور ثقیل کھانوں سے اٹی ہوئی تھی۔ صاحب خانہ میزبانی میں پٹھانوں کی روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ فرما تے رہے۔

کھانے کے بعد میزبان نے اپنی زندگی کے چند ایک واقعات سنا کر یہ ثابت کیا کہ اگر وہ نماز نہ پڑھتے تو جیل سے ان کی رہائی نہ ہوتی۔ وہ اتنے کامیاب آدمی نہ ہوتے، ان کے پاس اتنی دولت نہ ہوتی اور پھر انہوں نے مرشد کریم سے براہ راست

سوال کیا کہ آپ اپنے مریدوں کو نماز کی تلقین کرتے ہیں۔ جواب اثبات میں پا کر بھی انہیں تسلی نہ ہوئی تو کہا "میرا یہ چھوٹا بھائی تو نماز کی پابندی نہیں کرتا۔" ان کے لہجے میں شکایت تھی۔ مرشد کریم نے کسی بھی قسم کا کوئی تاثر لئے بغیر ان سے بات جاری رکھی۔ مرید نے اپنی طبیعت پر جو بوجھ اس گھر میں داخل ہوتے ہی محسوس کیا تھا وہ چند ہو کر دوبارہ طاری ہو گیا۔ عثمان صاحب اور رفاقتی صاحب نے کچھ محسوس کیا یا نہیں۔ ممتاز علی نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو مراد نے انگلی کے اشارے سے انہیں روک دیا۔ بڑوں کی موجودگی میں جب تک وہ خود نہ کہیں زبان کھولنا آداب محفل اور حفظ مراتب دونوں ہی کے خلاف ہوتا ہے۔

وہاں سے نکل کر ہم شفیق صاحب کے گھر آئے۔ وہاں محبت کا گداز دیکھ کر یوں لگا ہم چھاؤں میں آ گئے ہیں۔ غیروں سے ہٹ کر اپنوں میں آنے کا مزہ تازہ ہو گیا۔ اپنائیت کا وہ احساس جو اس محل میں کہیں نہ تھا یہاں اس مکان میں فراوانی سے پھیلا ہوا تھا۔ چائے پی کر شفیق صاحب مرشد کریم کو اوپر کی منزل دکھانے کے بہانے، اپنے دکھوں کا مداوا مانگنے، انہیں لے کر وہاں سے ہٹ گئے۔

مراقبہ ہال واپسی کے دوران سب نے باری باری ان صاحب کے بارے میں تبصرہ کیا کہ وہ اپنے بھائی کے ہم عصروں سے میل جول پر خوش نہیں ہیں۔ حضور نے

اس بارے میں کوئی بات نہیں کی جب ان سے رجوع کر کے دریافت کیا تو فرمایا ۔''اپنی اپنی سوچ ہے ۔آپ سوچیں!'' یہ کہہ کر خاموش ہو گئے ۔ میں نے سوچا لوگ اللہ کی بات تو مانتے نہیں ۔اگر انہوں نے مرشد کی نہ مانی تو کونسی بڑی بات ہوئی اور مرشد کی طرف دیکھا ۔وہ گاڑی سے باہر دیکھ رہے تھے ۔

اگلے روز صبح سویرے پشاور سے جمشید، زبیر اور قریشی صاحب اور ایک مراقبہ ہال کے انچارج ڈاکٹر ممتاز اختر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ پہنچ گئے ۔وہ مرشد کریم کے اپنے ہمراہ لے کر جانا چاہ رہے تھے ۔ بحث و تمحیص کے بعد طے یہ پایا کہ مرشد کریم اٹک تک ڈاکٹر اختر کے ہمراہ جائیں گے وہاں سے آگے وہ پشاور کے لئے جمشید صاحب کی گاڑی میں منتقل ہو جائیں گے ۔ممتاز اختر صاحب کی طبیعت میں صلح جوئی کے ساتھ ساتھ فیصلہ کرنے اور کئے ہوئے فیصلے پر عملدرآمد کرانے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے ۔

پنڈی مراقبہ ہال سے روانگی کا منظر دیگر مراقبہ ہالوں سے روانگی کے مناظر سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا ۔ایک معزز اور معتبر ہستی سے بچھڑنے کا تاثر، دوبارہ ملنے کی امید، ملاقات سے حاصل ہونے والی خوشیوں سے دھلے چہرے، الوداعی انداز میں ملتے ہاتھ، در پیش سفر بخیر ہونے کی دعائیں اور دعا کو ہونے کی التجاؤں کے درمیان گاڑی

مری، حسن پنڈی سے نکلی۔اب گاڑی میں ڈرائیور اور ممتاز اختر صاحب نئے چہرے تھے۔باقی وہی جو لاہور سے آغاز سفر کئے ہوئے تھے۔ممتاز علی اور میں نے مراد کی ہمراہی دوبارہ نصیب ہونے پر تشکر کا احساس اپنے اندر موجزن پایا۔

****

ایک جاتے ہوئے راستے میں سوچا کہ اس گاڑی کو پیچھے سے دیکھنے والوں کو کیا محسوس ہو رہا ہوگا۔ایک عام سی گاڑی جس میں پانچ افراد سوار ہیں یا ایک بہت معزز ہستی کو سواری والی گاڑی۔ مجھے مرشد کریم کی کہی ہوئی ایک بات دھیان میں آئی۔ کراچی میں ایک بار وہ ائیرپورٹ گئے۔وہاں جاتے ہوئے راستے میں دو رویہ پولیس کھڑی تھی اس روز وزیر اعظم یا صدر نے وہاں آنا تھا۔سیکورٹی کے انتظامات دیکھ کر میرے مراد کے ہمراہ ایک صاحب نے کہا دنیا کے حاکموں کے لئے تو نشانات امتیاز ہوتے ہیں۔اس طرح باطنی دنیا کے حاکموں کے لئے بھی کوئی نشان ہونا چاہئے۔کوئی جھنڈا یا کوئی کارڈ وغیرہ۔لطیف بھائی نے بہت اچھی بات کہی۔انہوں نے کہا اگر ہمیں جھنڈا وغیرہ لگا کر نمایاں کر دیا جائے تو ہمارا ائیرپورٹ تک پہنچنا ہی دوبھر ہو جائے۔لوگ قطار اندر قطار ہاتھوں میں درخواستیں لئے کھڑے ملیں۔اس پر فرمایا ”فقیر بھی بادشاہ ہی ہوتا ہے۔صرف اس کا تاج نہیں ہوتا۔“

فقیر کی باد شاہت کے خیال سے جانے کیسے گفتگو حضور قلندر بابا اولیاؒ کے بازو پر بندھے تعویز تک جا پہنچی۔ اس پر بتایا کہ اس تعویز میں دراصل تین تعویز ہیں۔ ایک وارث شاہ صاحبؒ، دوسرا عبدالرحیم صاحبؒ نے لکھ کر دیا تھا اور تیسرا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عطا کیا تھا۔ ہم نے حیرت کا اظہر کئے بغیر دریافت کیا۔ ''حضورؐ نے؟'' فرمایا ''جی ہاں۔ انہوںؐ نے جسمانی طور پر مرحمت فرمایا تھا۔'' پھر بتانے لگے کہ حضور قلندر بابا اولیاؒ نے اسی سال سے زیادہ عمر پائی۔ یہ دونوں تعویز ان کے پاس ان کے بچپن سے تھے۔ بچپن سے اتنی عمر تک ان تعویزوں کی حفاظت کرنے کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ پہلے پہل تو ان کی والدہ نے ان کا خیال رکھا ہوگا۔ پھر وہ خود ان کی حفاظت کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ جب اماں بی یعنی اپنی بیگم سے اس کا کپڑا بدلواتے تو اپنی نگاہوں کے سامنے۔ وہ بہت جز بز ہوا کرتیں کہ تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتے۔ حضور قلندر بابا اولیاؒ کی وفات کے بعد ان کے ایک عزیز نے وہ تعویز تبرکاً مانگ کر پہن لیا۔ وہ لکھ پتی سے ہزار پتی ہوئے اور پھر جب روٹی کے لالے پڑ گئے تو تعویز لا کر واپس اماں بی کو پیش کر دیا۔ وارث شاہؒ، عبدالرحیمؒ، فضل الرحمٰن گنج آبادیؒ، بابا تاج الدین بابا اولیاؒ اور شرڈی کے سائیں بابا یہ پانچوں ایک ہی دور میں آئے تھے۔ یہ بہت زرخیز اور عطا کا دور تھا۔ ایک ہی وقت میں اتنے بلند پایا لوگوں کا عطا ہوا قدرت کی فیاضی تھی۔

پھر بتایا کہ فضل الرحمٰن گنج آبادی کے خلیفہ مجاز ان سے ملنے آئے تھے۔ وہ بہت ضعیف العمر تھے۔ ان کے ہمراہ بہت سے لوگ بھی آئے تھے۔ فرمایا۔ ''میں انہیں عزت واحترام سے ملا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں دیکھنے آیا ہوں۔ تم ڈیوٹی پر ہو۔ مجھ سے بہت سے لوگ ملے اور یہی کہا۔ ہم تمہیں دیکھنے آئے ہیں تم ڈیوٹی پر ہو۔'' ہمارے ذہنوں میں یہ سوال مچل کر ہی رہ گیا ''ڈیوٹی۔ کیسی ڈیوٹی؟ کہتے ہیں کہ قلندر کے سامنے انسان وہی کچھ کہہ سکتا ہے جو وہ سننا چاہتے ہوں وہ کچھ کہہ ہی نہیں پاتا جو وہ خود سنانا تو چاہتا ہو مگر وہ سننے پر آمادہ نہ ہوں۔ انہوں نے خود ہی اس کا جواب دے دیا۔'' لوگوں کی خدمت کرنا ہی یہ ڈیوٹی ہوگی تبھی تو کروا رہے ہیں۔''

پھر ایک واقعہ اپنے دادا جناب خلیل سہارنپوری کا سنایا کہ والد صاحب نے ایک زمین کا ٹکڑا اپنے سسر سے خریدا۔ انہوں نے کہا کہ میں زمین تمہارے نام پر منتقل کرنے کے بجائے بیٹی کے نام ہبہ کر دیتا ہوں تاکہ میرا بھائی حق شفع کا دعویٰ نہ کر سکے۔ والد صاحب نے کہا واہ پیسے ہم دیں اور زمین آپ بیٹی کو دیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ نہیں مانے تو ان کے سسر نے انتقال زمین کے کاغذات داخل کر دیئے۔ ان کے بھائی نے حق شفع کا دعویٰ کر دیا۔ مقدمہ شروع ہو گیا۔ دیوانی مقدمہ تھا۔ اس اثناء میں والد صاحب کے حج پر جانے کا پروگرام بن گیا۔ اس زمانے میں حج پر جانے آنے میں مہینوں لگا

کرتے تھے۔ وہ جاتے ہوئے مختار نامہ اپنے والد یعنی دادا ابا کو دے گئے۔ پیشی کی تاریخ آئی تو دادا جی نے پیشی پر جا کر کہا میں انتظار کا قائل نہیں۔ اس مقدمے کا فیصلہ آج ہی ہونا چاہئے۔ جب بات لمبی ہونا شروع ہوئی تو انہوں نے مدعی کو مخاطب کر کے پوچھا کیا تو سچ کہتا ہے کہ یہ زمین تیری ہے اور تجھ ہی کو ملنی چاہئے۔ اس نے اقرار کیا۔ انہوں نے اس سے حلف لیا۔ اس نے حلفیہ کہہ دیا۔ انہوں نے لکھ کر دے دیا کہ آج سے یہ زمین اس کی ہوئی۔ اب ہوا یہ کہ کچھ عرصے بعد اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہ معذور ہو کر پڑ گیا۔ بیوی کو چوری کی لت لگ گئی۔ وہ جہاں بھی جاتی کچھ نہ کچھ چوری کر لیتی اور پکڑی جاتی۔ بے عزتی اٹھاتی۔ بے عزتی اٹھاتے اٹھاتے بھیک مانگنے لگی۔ یہ خود بیمار ہوئے۔ پورے جسم پر ایسے متعفن پھوڑے نکل آئے کہ الاماں۔ کوئی پاس تک نہیں پھٹکتا تھا۔ ایک عیسائی جراح اپلوں کی راکھ دور کھڑے کھڑے ان پر چھڑک دیا کرتا۔ اس سے ان کو قدرے سکون ملتا۔ وہ اسی حالت میں مر گئے۔ وہ زمین وہیں کی وہیں رہ گئی۔ ٹھڈے کی ٹھڈے، بے آباد اور ویران پڑی ہے اب تک۔ ادھر ہم سب بہن بھائیوں کے اپنے اپنے مکان ہیں۔ بہن کی جتنی اولادیں ہیں آگے ان کے اپنے اپنے مکان ہیں۔" یہ قصہ سنا کر فرمایا۔ "اپنا مکان ہونا چاہئے مگر جائیداد نہیں۔ جائیداد ہو گی تو اولاد ضرور لڑے گی۔ جائیداد کے باعث رشتوں میں ایسی دراڑیں پڑ جاتی ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ جائیداد

چھوڑنا اولاد کے ساتھ برا کرنا ہے۔"

"اس کے برعکس یہ دیکھیں کہ میراں جی بھی بہت بڑے بزرگ ہوئے۔ وہ ہمارے دادا سے خوش ہوئے۔ انہوں نے اپنی چادر تان کر ان کے پورے گھر کو اس کے نیچے کھڑا کیا اور ان کے لئے دعا کی۔ فرمایا یہ اس دعا کا اثر ہے کہ ہمارے خاندان کا ہر فرد اپنے اپنے شعبے میں کمال فن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ان کے دماغ خوب کام کرتے ہیں۔ عم انجینئر ہوتے ہوئے وہ اپنے اپنے شعبوں کی سربراہی کرتے ہیں۔"

ایک شہر پہنچے۔ گاڑی چھاؤنی کے علاقے سے ہوتی ہوئی شہر سے باہر کی طرف چلتی چلی گئی۔ ہم شہر سے نکل کر کھلے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ شہر سے چند ایک میل دور آکر کھلی فضاؤں، کھلے کھیتوں کی طرف کچے راستوں پر گاڑی مڑ گئی۔ ڈاکٹر صاحب بتا رہے تھے کہ انگ مراقبہ ہال کے ارکان نے اس زمین پر ایک ہال کمرہ اور ایک دو چھوٹے کمرے اور کچن وغیرہ بنا لئے ہیں۔ سڑک سے ایک دو فرلانگ دور آکر گاڑی ایک لوتعمیر عمارت کے درمیان رک گئی۔ مرشد کریم نے گاڑی سے باہر نکل کر استقبال کو آنے والوں کو دعاؤں سے نوازا۔ ڈاکٹر صاحب لوگوں کو ہال میں بیٹھنے کا کہہ کر مرشد کریم کو ساتھ لیکر زمین اور عمارت کا معائنہ کروانے لگ گئے۔ میرے مراد نے ان کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ان کی بہت تعریف کی۔ ان کی ہمت کی داد دی۔ ان کی لگن

اور ذوق وشوق میں استقامت کی دعا کی۔ کھلی فضا میں ایک لو فیز عمارت کو دیکھا لی چاروں طرف کھیت ہی کھیت اور ایک طرف کوئی فرلانگ بھر دور ایک دوسری عمارت۔ بتایا گیا یہ ایک سکول کی عمارت ہے۔ یہاں مسجد بنے گی۔ پہلے یہاں مونگ پھلی کاشت ہوتی تھی اب یہاں آڈیٹوریم ہوگا۔ یہاں لائبریری ہوگی۔ یہاں وہ ہوگا یہاں یہ ہوگا میں نے سوچا۔

ع کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد

دوپہر کے کھانے کا دو جگہ انتظام تھا۔ مردوں اور عورتوں کو لنگر میں سے الگ الگ کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ مرشد کریم اور پشاور سے آئے ہوئے مہمانوں کے لئے پرہیزی کھانا۔ کھانے میں گھیوار کا سالن دیکھ کر میں نہ رہ سکا۔ اپنی حیرت کے اظہار کے بعد ڈاکٹر صاحب سے اس سالن کو بنانے کی ترکیب پوچھ بیٹھا۔ ڈاکٹر صاحب کے جواب دینے سے پیشتر مرشد کریم نے شفقت سے یہ کہتے ہوئے منع کر دیا۔ ''ہر چیز جاننے کی نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر بات ذہن میں رکھنے کو ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر ممتاز اختر نے وقت کی کمی کے پیش نظر انتظام یہ کیا کہ مرشد کریم خطاب فرمائیں اور سوال جواب کی نشست کے بعد چند ایک خاص مریض ان سے مشورہ کر لیں۔ مراقبہ ہال کے کمرے میں لوگ ساعتوں کے کاسے پھیلائے مرشد کریم

کے افکار کے موتی سمیٹنے کو بے تاب و منتظر بیٹھے تھے۔ پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

مرشد کریم نے اپنے مخصوص دھیمے، نرم اور کومل انداز میں تقریر کا آغاز کیا۔

سب کا وہاں آنے پر شکریہ ادا کرنے کے بعد فرمایا۔

''اگر کسی آدمی سے یہ سوال کیا جائے کہ وہ کوئی کام کیوں کرتا ہے تو اس کا جواب وہ دے دیتا ہے۔ آپ پوچھیں سوتے کیوں ہو۔ اس کا بھی جواب دے گا۔ آرام کرنے کے لئے۔ آپ پوچھیں کھیتی باڑی کیوں کرتے ہو۔ جواب ملے گا۔ کھیتی باڑی خوراک کے حصول کے لئے ہی تو کی جاتی ہے۔ شادی کیوں کرتے ہو تو وہ کہے گا۔ نسل انسانی میں تسلسل اور اضافے کے لئے۔ غرضیکہ ہر فعل کا مقصد بیان کر دے گا۔ لیکن اس سے اس زمین پر اس کی پیدائش اور موت کے متعلق دریافت کریں تو اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ آخر تمام عمر کی جدوجہد کے پیچھے کوئی مقصد ہوگا۔ آخر وہ کونسا مقصد کار فرما ہے۔''

''زمین کے متعلق اگر یہ پتہ ہو کہ ایک روز اس نے چھن جانا ہے تو آپ اس پر اپنا مکان نہیں بناتے لیکن ہماری پیدائش کے بعد ہمیں جو زمین عارضی طور پر ملتی ہے اس کے بارے میں یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ زمین عارضی طور پر ہمیں دی گئی ہے۔ ہم اس کے عوض ایک پیسہ بھی اللہ کو نہیں دیتے۔ انسان اس زمین کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اس کی

قیمت لیتا ہے اور دیتا ہے۔ اگر ہمیں کوئی مکان دیا جائے اور ملکیت ہماری نہ ہو تو ہم اس پر کوئی مال خرچ نہیں کرتے۔ آپ کو ایک بچہ دے دیا جاتا ہے کہ آپ اس کی تربیت کریں اس اس کے عوض ماہانہ یا سالانہ رقم لیتے رہیں۔ آپ اس بچے کی نگہداشت کرنے اور تربیت دینے کے باوجود اس بچے کو اپنا بچہ نہیں کہتے۔ یہ صورت حال زندگی کے مختلف شعبوں میں نظر آتی ہے۔ یہاں اس زندگی میں اس دنیا میں یہ انسان محض ایک Care Taker کی حیثیت سے مختلف اشیاء پر تصرف رکھتا ہے۔ بیوی پر آپ کی کوئی ملکیت نہیں بچوں پر آپ کی کوئی ملکیت نہیں۔ یہاں پر کسی بھی شے پر کسی کو کوئی ملکیت نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ فلاں چیز میری ملکیت ہے غاصبانہ طرز فکر ہے۔"

"زمین کے اصل مالک کو آپ ایک پیسہ تک نہیں دیتے۔ یہاں جو بھی شے استعمال کی جاتی ہے اس کی ملکیت کا دعویٰ دار ہونا کس قدر حق بجانب ہے۔ ہم یہاں پر عطا کی گئی اشیاء کو استعمال کرتے ہیں لیکن بتاتے نہیں کہ یہ شے مجھے عطا کی گئی ہے۔ قائم خود کو اس شے کا، اس زمین کا مالک سمجھتے ہیں۔ لوگ چھینا جھپٹی میں اس قدر الجھ گئے ہیں کہ ان کے نقوش تک بگڑ گئے ہیں۔ چونکہ ملکیت کا تصور ہی غاصبانہ اور بزدلانہ امر ہے اس لئے ہر آدمی بے چین اور پریشان ہے۔"

"اگر آپ کسی مکان میں رہتے ہیں آپ کے ذہن میں مکان کے بارے

میں بدبختی آ جائے تو آپ پریشان ہو جائیں گے۔ اس دنیا کو بھی ایک مکان کی مثال سمجھیں۔ اس کے وسائل کو عطا سمجھیں۔ اگر پانی نہ ہو تو ساری دنیا مر جائے گی۔ اللہ کہتا ہے ہم نے تمہیں پیدا کیا کہ تم ان وسائل کو استعمال کرو۔ جب انسان نے جنگل کی کٹائی کی اور اللہ کے علم میں یہ بات آ گئی کہ یہ انسان کٹے ہوئے پودوں کی کمی کو پورا کرنے کے لئے پودے نہیں لگا رہا تو اللہ نے تیل نکال دیا۔ جب تیل کے وسائل بے تحاشا خرچ کئے گئے تو اللہ نے انسان کے لئے گیس نکال دی۔''

''اللہ تعالیٰ گندم کے ایک بیج کے عوض ستر دانے اگاتا ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ یہ سب کیوں کر رہا ہے؟۔۔۔ کیونکہ اللہ نے مخلوق کو اس سے پوچھ کر پیدا نہیں کیا۔ چونکہ اللہ نے مخلوق کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔ اس لئے اس نے اس کی حیات کے تمام وسائل کی فراہمی اپنے ذمہ لے لی ہے۔ آپ اپنی مرضی کے بغیر پیدا ہو کر۔۔۔ اپنی مرضی کے بغیر زندہ رہ کر۔۔۔ اپنی مرضی کے بغیر مرنے پر مجبور ہونے کے باوجود وسائل کو اپنی مرضی کا پابند رکھنا چاہتے ہیں؟''

''میرا باپ، میری ماں۔۔۔ اگر یہ سب کچھ آپ کی ملکیت میں ہیں تو یہ سب چھن کیوں جاتی ہیں۔ یہاں ہر شے عارضی ہے۔ لیکن آپ ہر مشاہدے کو جھٹلاتے اور ہر تجربے کو رد کرتے ہیں اور ہر شے کو حقیقی سمجھتے ہیں۔ جوانی میں آپ کہتے ہیں ہم اس لئے

پیدا ہوئے ہیں۔ ہم یہ کریں گے، ہم وہ کریں گے۔ لیکن بڑھاپے میں جب قبر نظر آنے لگتی ہے تو انسان سوچتا ہے کہ میں نے یہ سب کیوں کیا؟"

"اگر آپ زمین اور اس پہ اپنے قیام کو عارضی سمجھیں گے تو خود بخود آپ کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے گی کہ ہم اللہ کے مہمان ہیں۔ اگر میزبان اچھے کھانے کھلاتا ہے اور ہم اس کے شکر گزار ہوں تو نتیجے میں وہ ہم سے خوش ہوگا اور عنایات دو چند کر دے گا۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے آپ یہ سمجھیں کہ اگر آپ مہمان نہیں تو آپ اس کے دیئے ہوئے وسائل کے بغیر رہ کر دکھائیں۔ اس کے پاس سے آئے ہیں۔ اسی کے پاس واپس لوٹ جائیں گے۔ یہ مہمانداری یہاں پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ اس دنیا سے لے کر اعراف تک ۔۔۔ عالم اعراف سے لے کر حشر نشر تک۔ عالم ارواح سے لے کر جنت و دوزخ تک ۔۔۔ سب مہمانداری ہی تو ہے۔" "آپ ایک سیکنڈ میں آٹھ دس سال کی عمر میں واپس پہنچ جاتے ہیں۔ آپ کو ایک سیکنڈ میں اپنی پوری زندگی کی تصویر نظر آ جاتی ہے۔ درحقیقت ٹائم اور سپیس کچھ نہیں۔ یہ سب اس میزبان کا کرم ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اس کو سمیٹ لیتا ہے اور جب چاہتا ہے اس کو پھیلا دیتا ہے۔"

"صبح اٹھ کر ہم کہتے ہیں کہ ہر شے نئی ہے۔ سورج بھی وہی رہتا ہے۔ زمین میں بھی کوئی ردوبدل نہیں ہوتا۔ یہ بھی اس میزبان ہی کی مہربانی ہے کہ وہ روز و شب کے

ردوبدل سے دن رات میں خرچ کی گئی توانائی کو پورا کر دیتا ہے۔آپ اچھے مہمان نہیں تو میزبان آپ سے کبھی راضی نہیں ہوگا۔آپ اچھے مہمان بنیں گے تو آپ کو اگلی منزل پر بہتر میزبانی ملتی ہے ورنہ کال کوٹھری۔۔۔"

''ہم کھا اللہ کا رہے ہیں۔۔۔گا اپنا رہے ہیں۔رات دن مزدوری کر لیں جب اللہ پانی نہیں برسائیں گے تو آپ کہاں سے لائیں گے پانی؟۔۔۔اگر آپ مان لیں کہ آپ اللہ کے مہمان ہیں یہ دنیا ایک سرائے ہے۔ایک ریل گاڑی ہے۔تو یہ صراط مستقیم ہے۔اس سب شواہد کے باوجود اگر کوئی انسان اس دنیا کو کاپنی ملکیت سمجھے تو یہ کھلی گمراہی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔"

''انسان کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اس ذات کو پہچانے جو اس زندگی میں اس کا میزبان ہے۔آپ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا کھوج لگائیں گے۔وسائل کے بارے میں تفکر کریں گے تو ایک اللہ ہی سامنے آئے گا۔جب آپ نے اللہ کو دیکھ لیا تو آپ کے یہاں آنے کا مقصد پورا ہو گیا۔یہی جنت ہے ورنہ دوزخ۔۔۔اللہ کو جاننے والوں کے دلوں میں یہ امر خوب اچھی طرح راسخ ہو جاتا ہے کہ ہر شے کے پیچھے اللہ اور صرف اللہ ہی ہے۔"

خطاب سننے کے بعد عجیب کیفیت تھی۔یوں لگتا تھا جیسے ہر سوال کا جواب

دے دیا گیا ہو۔ حضور نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہ اگر کسی نے کوئی سوال پوچھنا ہو تو پوچھ لے۔ اور جب کوئی سوال نہ آیا تو مائک ہٹا دیا۔ مائک ہٹا کر پیچھے ہٹ کر بیٹھے تو ڈاکٹر صاحب نے لوگوں کو باری باری آگے آ کر مرشد کریم سے ملنے کا کہا۔ مرشد کریم لوگوں سے فرداً فرداً مل رہے تھے۔ ہم باہر نکل کر اتک مراقبہ ہال کے ارکان سے ملنے لگے۔ ان کی کوششوں اور کاوشوں کو سراہتے ان سے اپنے لئے دعا کا کہتے تو وہ مسکرا دیتے۔ "یہ سب حضور کرکرم نوازی ہے۔" مرشد کریم کی عنایت ہے۔ کسی کو کسی کریڈٹ کا شوق ہی نہیں تھا۔

شام ڈھلنے سے پہلے ہم پشاور کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ اب ہماری نشست اپنے مراد کے پیچھے جانے والی ویگن میں تھی۔ ممتاز علی اور میں اس ویگن میں پچھلی سیٹوں پر خاموش بیٹھے۔ طبیعت میں در آنے والی اداسی پر غور کر رہے تھے۔ شاید یہ اپنے مراد سے دور ہونے کا سبب تھا یا دوسرے بھائیوں کے ان کے قریب ہونے پر میں حسد کا شکار ہو رہا تھا۔ بہرحال جب خود کو بہلا نہ سکے تو آنکھیں موند لیں۔ گاڑی کے ہچکولے جھولے بن گئے اور ہم سو گئے۔

****

گاڑی رکی، دیکھا نوشہرہ میں جی ٹی روڈ پر نعمت بھائی کی دکان کے سامنے کھڑے ہیں۔نعمت صاحب ایک صاحب دل بہت روشن نظر انسان ہیں۔مرشد کریم کو دیکھتے ہیں تو کن انکھیوں سے۔نظریں جھکی جھکی رہتے ہیں۔مرشد کریم کے سامنے میں نے ان کے ہاتھ ادب سے بندھے ہوئے ہی دیکھے ہیں۔ہم پہنچے تو مرشد کریم دکان کے باہر لوہے کی کرسی پر بیٹھ چکے تھے اور نعمت صاحب ہاتھ باندھے قریب کھڑے تھے۔

مجھے ایک سال پہلے کی بات یاد آگئی۔ہم مرشد کریم کے ہمراہ پشاور سے چندی جا رہے تھے۔پشاور سے نکلے اور نوشہرہ پہنچے تو سہ پہر کا وقت تھا۔نعمت بھائی سے مل کر گاڑی میں بیٹھے تو ایک فقیر سا آدمی آیا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر اس نے پشتو میں کچھ کہا۔ہم سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔اقبال قریشی صاحب سے مرشد کریم نے پوچھا یہ کیا کہہ رہا ہے۔انہوں نے اس کو بھکاری جانتے ہوئے جیب سے کچھ پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔اس نے دہائی دینے کے انداز میں کہا مجھے پیسے نہیں اجازت چاہئے۔الحمد کی

اجازت ۔قریشی صاحب نے ترجمہ کر کے بتایا کہ حضور یہ کہہ رہا ہے ۔مرشد کریم نے عجیب طرح سے بائیں ہاتھ کو ہلا کر کچھ اشارہ کیا اور کہا۔ ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے'' اس شخص نے دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھا کر منہ سے تشکر کے الفاظ ادا کئے ۔مرشد کریم نے گاڑی بڑھانے کا اشارہ کیا۔ ہمارے سینوں میں سوال مچلتے ہی رہ گئے ۔یہ کون تھا؟ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ اس نے کس چیز کی اجازت مانگی؟ وہ اتنے لوگوں کو چھوڑ کر سید حامر شد کریم ہی کے سامنے دست سوال دراز کرنے کیسے پہنچ گیا؟ کیا اس کو پتہ تھا کہ آپ کون ہیں؟ اس کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ آپ اس وقت ادھر سے گزریں گے؟ ہم پنڈی پہنچ گئے مگر اس دوران نہ کوئی بات ہوئی اور نہ کوئی جرات ہی کر سکا ۔ اب بھی اقبال قریشی صاحب اس واقعہ کو یاد کرتے ہوئے اس بندے کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے پھر ہم نے اس شخص کو دوبارہ کبھی نہیں دیکھا۔

پشاور مراقبہ ہال میں داخلے کا رنگ کچھ اور ہی تھا۔گاڑی میں سے مرشد کریم اترے تو دو رویہ کھڑے بھائیوں نے باری باری ان کو ہار پہنائے پس منظر میں ٹیپ ریکارڈ پر ''میرا پیا گھر آیا'' کا گیت بج رہا تھا۔ ماحول میں یکدم محبت ہی محبت گھل

گئی۔ پھولوں کی پیتاں نچھاور ہوگئیں اور آپ نے پشاور کے لوتعمیر مراقبہ کی عمارت میں قدم رکھا۔ ''جیسے گڑیا کا گھر ہو'' بعد میں تبصرہ فرمایا۔

نیاز احمد عظیمی صاحب نگران پشاور مراقبہ ہال کی طبیعت میں گداز بہت ہے۔ ان کے بارے میں مرشد کریم نے فرمایا تھا کہ وہ تو عاشق ہیں۔ ہر وقت تصویر یں اتارتے رہتے ہیں۔ ایک موقعے پر فرمایا کہ آپ نے دیکھا ان کے چہرے پر کس قدر معصومیت ہے۔ نیاز صاحب جب مرشد کریم سے کوئی بات سن رہے ہوتے ہیں تو میں نے اکثر ان کے چہرے پر دھواں پھیلتے دیکھا ہے۔ یہ دھواں کبھی کبھی بادل بن جاتا ہے اور کبھی تو آنکھوں سے

فضا میں رات کی آوازیں پھیلتی چلی جا رہی تھیں۔ کہیں مینڈک ٹرا رہے تھے، اور کہیں جھینگر بول رہے تھے۔ ہم اپنے مراد کے ہمراہ پشاور کے نا نا والا رک میں گھوم رہے تھے۔ مرشد کریم نے حیات آباد کے اس پارک کو پسند کیا۔ اور فرمایا یہ مینڈک اور جھینگر دن میں نہیں بولتے۔ بلکہ دن میں تو نظر بھی نہیں آتے۔ ان کی آوازیں رات کے حواس سے متعلق ہیں۔ جب حضورؐ پر وحی آتی تھی، تو وہ بھی پہلے گھنٹیوں اور جھینگروں کی

آوازیں سنا کرتے تھے، جھینگر کی آواز تو خصوصاً رات کے حواس میں سے ہے۔'' مرید نے عرض کی حضور میرے کانوں میں تو یہ آواز دن رات گونجتی رہتی ہے۔'' فرمایا۔'' آپ تو رہتے ہی ماورائی دنیا میں ہیں۔'' اس پر ایک بہت پرانا سوال ابھر کر سامنے آگیا سو وہی عرض کیا گیا۔'' یہ صوت سرمدی کیا ہے؟''

فرمایا'' اللہ کی آواز کو صوت سرمدی کہتے ہیں۔ جس نے ایک بار وہ آواز سن لی، وہ عمر بھر اسی چکر میں رہتا ہے کہ کسی طور اس کو دوبارہ سنے۔'' پھر کچھ توقف کے بعد فرمایا۔'' سننے والے کم ہی ہوتے ہیں۔ دیکھنے والے زیادہ۔ اور وہ خوش نصیب تو بہت ہی کم ہیں جو اس کو مسلسل سنتے رہتے ہیں۔''

صبح پشاور مراقبہ ہال پہنچا تو مراقبہ ہو چکا تھا، دیکھا کہ مرشد کریم نیاز صاحب کے ساتھ گیٹ پر ہی کھڑے ہیں۔ گیٹ سے باہر سینماؤں کی بڑی بڑی تصاویر دیکھ کر نیاز صاحب کو چھیڑتے ہوئے کہا۔'' نیاز بھائی آپ کے ہاں لوگ کچھ زیادہ ہی صحت مند ہوتے ہیں'' ایک ساتھ رہ نہ سکے عرض کی'' یہ بڑا گوشت کھانے کے سبب ہے۔'' فرمایا۔ ''سبب ہے یا انجام؟''

وہاں ایک بات اور بھی فرمائی۔ '' روشنی اور آواز روحانیت کی دشمن لیکن یہ سلسلہ عظیمیہ کا اعجاز ہے کہ ان دونوں کے بھرپور اضافے کے باوجود لوگوں کو روحانیت

سکھائی جارہی ہے۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی لئے تو غارِ حرا جایا کرتے تھے، حالانکہ اس وقت نہ راتوں کو اتنی تیز روشنی ہوا کرتی تھی، اور نہ ہی آوازوں کا یہ بے ہنگم شور و غل۔"

صبح ناشتے کے بعد حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے حوالے سے ایک واقعہ سنایا کہ پاس کہ ان کے پاس دو اصحاب آیا کرتے تھے۔وہ آتے اور کافی دیر بیٹھے رہا کرتے۔ الٹے سیدھے سوالات پوچھتے رہتے۔ایک بار انہوں نے حضور سے دریافت کیا آپ کیا ہیں؟ فرمایا" اس کے ذہن میں ہوگا کہ حضور کا تکوینی لحاظ سے رتبہ یا عہدہ کیا ہے؟ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نہ جانے اس وقت کس موڈ میں تھے فرمایا" میں خدا ہوں" اس پر وہ صاحبان خاموش ہو گئے اور پھر اٹھ کر چلے گئے۔ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے مرشد حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے عرض کی حضور آپ نے ان کے سامنے ایسا کیوں فرمایا؟ انہوں نے اس کے جواب میں فرمایا"خواجہ صاحب میں خود کو خدا کہنے سے خدا ہو تو نہیں گیا، لیکن ان سے تو پیچھا چھوٹا۔" اور واقعی اس کے بعد وہ دوبارہ کبھی نظر نہیں آئے۔

فرمایا" اس طرح ایک صاحب ہیں۔آج کل ملیر میں رہتے ہیں، آپ کراچی آئیں گے تو میں آپ کو ان سے ملواؤں گا۔وہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے ملنے آتے تو ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔۔ایک بار وہ کھڑے تھے کہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے ان سے کہا"۔۔۔اللہ میاں آئے ہوئے ہیں!" انہوں نے بسم اللہ پڑھی۔زمین پر بیٹھے اور

سجدہ ریز ہو گئے، اللہ نے ان پر ایسا کرم کیا کہ ان کی باطنی آنکھ کھل گئی۔ آج کل وہ ملیر میں خدمتِ خلق کرتے ہیں۔" پھر فرمایا۔ "یہ سب یقین کرنے کی بات ہے۔ انہوں نے یقین کیا اور مراد کو پہنچے، دوسروں نے نہیں کیا، وہ محروم رہے۔"

ایک صاحب نے مہنگائی کا تذکرہ کیا اور شکوہ سنج انداز میں کہا کہ اب اس مہنگائی کے ہاتھوں گزارہ کرنا مشکل ہو چکا ہے۔ اس پر فرمایا "جی یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ آج سے چالیس پچاس سال پہلے لوگ اتنا کہاں کھاتے تھے، جس قدر آج کل کھاتے ہیں، پہلے مرغی مہینوں میں کبھی ایک آدھ بار پکتی تھی۔ لوگ پاؤ بھر گوشت خریدتے تھے۔ گھر میں اے سی، فریج اور ٹی وی وغیرہ کہاں ہوتے تھے۔ اب ہر آسائش پہلے سے بہتر ہے، فراوانی میں ہے۔ پہلے لوگوں کے پاس ایک دو جوڑے جوتے ہوا کرتے تھے، اب جس گھر میں دیکھو، درجنوں جوتے پڑے سوکھ رہے ہیں۔ آپ کہتے ہیں مہنگائی ہو گئی ہے، تو کیا آپ نے گوشت خریدنا بند کر دیا ہے۔ اب کسی وقت دسترخوان پر گوشت نہ ہو، یہ آپ کو گوارا ہی نہیں۔ یہ سب ناشکری کی باتیں ہیں۔"

ہم خود بھی مہنگائی کا رونا رونے والوں میں پیش پیش رہا کرتے تھے، یہ زاویہ نظر دیکھ کر تو یوں لگا، جیسے آنکھیں ہی کھل گئی ہوں، مہنگائی کا رونا ہم فیشن کے طور پر کرتے ہیں اور اس طرف نظر ہی نہیں جاتی کہ اس طرح ہم ناشکری کے مرتکب ہو کر

شیطان کے ہتھے چڑھ رہے ہیں۔ فقیر کی نظر کتنی گہری ہوتی ہے، وہ آپ کے اندر ہونے والی خرابیوں سے آپ کو اس غیر محسوس طریقے سے روشناس کراتا ہے کہ آپ کو یہ احساس ہی نہیں ہو پاتا کہ آپ کے اندر اس نے کتنی بڑی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔

ایک بار دلا ہور مراقبہ ہال میں اک صاحب نے کسی کے بارے میں بتایا کہ فلاں صاحب بہت برے آدمی ہیں۔ اس پر منہ موڑ لیا اور دبے سے لہجے میں کہا۔'' چھوڑ یئے۔ آپ کو کہنے کی کیا ضرورت۔'' یعنی آپ غیبت کے مرتکب ہو رہے ہیں، باز آ جایئے۔ اگر وہ برے ہیں، تو ہوا کریں، ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم دلچسپی لیں اور تذکرہ کریں۔ کہنے کے انداز میں تو یہ سب تھا مگر الفاظ میں شفقت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ دونوں کی عاقبت کی فکر البتہ صاف نظر آ رہی تھی۔

ناپسندیدہ بات پہ ردعمل کا عجب انداز ہے۔ بات سنتے ہی منہ موڑ لیں گے اور یہ بھی صرف اس وقت جب بات سن کر آپ کی اصلاح کرنا مقصود ہو۔ ورنہ آپ کرنا چاہ رہے ہیں اور یہ اٹھ کر چل دیں گے۔ آپ اس اشارے کو نہ سمجھیں اور ڈھٹائی پر اتر آئیں، تو پھر کھری کھری سنا دیں گے۔ ایک صاحب نے کہا، آپ میرے لئے دعا کریں۔ اس پر فرمایا'' میں آپ کے لئے دعا کیوں کروں۔ بھئی مجھے پہلے اس کا خیال نہیں رہتا تھا، میں اچھا جی۔ جی ہاں، کہہ دیا کرتا تھا، مگر پھر خیال آیا کہ یہ تو میں جھوٹ

بولتا ہوں، میں گنہگار رہوا۔ آپ دعائیں بہت کرواتے ہیں، مگر عمل کوئی نہیں۔ اب آپ عمل کریں، دعاؤں کو چھوڑیں۔"

کائناتی پروگرام پر اللہ کے کئے گئے، انتظامات کی بابت سمجھاتے ہوئے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کے ڈسپوزل پر بیس ہزار فرشتے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ جیسے نالائق افسر کے ماتحت بیکار رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں، بالکل اس طرح وہ لوگ جو اپنے فرشتوں سے کام نہیں لیتے، ان کو بھی بے کار کر دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی جگہ سے دو چار آدمی چلے جائیں تو وہ جگہ بے رونق لگنے لگتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہ فرشتے ہی ہیں۔ یعنی چار آدمی گئے، تو وہاں سے اسی ہزار فرشتے کم ہو گئے اور اس طرح اگر چار آدمی آئے تو ان کے ہمراہ اسی ہزار فرشتے بھی تو آئے۔"

مرید نے سوچا کہ بعض اوقات ایک ہی آدمی آتا ہے، تو گھر بھرا ہوا لگتا ہے رونق اور نکھار آ جاتا ہے، اور ایک آدمی کے جانے سے گھر تو گھر، پورا شہر، پورا سنسار بھائیں بھائیں کرنے لگتا ہے، تو کیا ایسے لوگوں کے ساتھ فرشتے زیادہ ہوتے ہیں، قلندر بابا اولیاؒ کا فرمودہ دھیان میں آیا کہ اولیا کرام میں سے بعض کو پچیس جسم دے جاتے ہیں اور ہنگامی حالات میں یہ جسم چالیس تک بھی ہو جاتے ہیں، یعنی اس حساب سے پانچ لاکھ سے لے کر آٹھ لاکھ فرشتے۔ جی میں آئی کہ پوچھا جائے کہ حضور آپ کے

ہمراہ کتنے فرشتے ہوتے ہیں، مگر جرات نہ ہو سکی۔

ایک بار میر امراد آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس گیا کہ انہوں نے جو بس پکڑنی ہوتی ہے، اس کا نمبر صاف نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر نے آنکھیں ٹیسٹ کیں اور ازراہ تفنن کہا۔ ''آپ کی آنکھیں تو ٹھیک ہیں، آپ کیا فرشتوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔'' اس پر اس کو کہا ''وہ تو میں دیکھتا ہی ہوں، مجھے تو آپ کی بسوں کے نمبر پڑھنے میں نہیں آتے۔''

انسانی فطرت کی بابت کوئی بات سمجھانی ہو تو اکثر کسی قصے کی صورت میں بیان فرماتے ہیں۔ فرمایا ''ایک بادشاہ کا دل ایک عورت پر آ گیا۔ عورت شادی شدہ تھی اور اسے اپنے شوہر سے محبت بھی بہت تھی۔ بادشاہ نے وزیر سے اس عورت کو حاصل کرنے کی تدبیر کرنے کو کہا۔ وزیر نے اس کے شوہر کو شاہی محل کے قریب ایک مکان رہنے کو دیا۔ پھر اس کے شوہر کو ایک ایسی دوائی دی کہ اس کو دست لگ گئے۔ یہ بندوبست اس نے پہلے ہی کر لیا تھا کہ تمام ملازم وغیرہ نکال دیئے تھے۔ عورت نے ایک روز تو اپنے خاوند کی خدمت کی۔ دو روز اور پھر جب آٹھ سے دسویں روز پر نوبت آئی تو وہ تنگ آ چکی تھی۔ اس کی غلاظت صاف کرتے کرتے۔ اس نے اٹھا کر خاوند کی چارپائی گھر سے باہر رکھوا دی۔''

اسی طرح ایک واقعہ ارشاد فرمایا کہ ''ایک عورت بہت لاپرواہ تھی۔ ہر وقت

اپنے ہی دھیان میں رہتی ۔ اس کا شوہر بیمار ہوا ۔ اس نے کچھ زیادہ پرواہ نہ کی ۔ وہ چند روز بعد مر گیا ۔ عورت نے یہ معلوم ہونے پر کہ اس کا شوہر فوت ہو چکا ہے، اٹھ کر کر بالائی لی اور شوہر کے منہ پر لگا دی تا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ فاقوں مر گیا اور رونا شروع کر دیا ۔ کہ بیچارا بالائی کھاتے کھاتے فوت ہو گیا ہے ۔''

ناشتے کے بعد خواتین سے ملاقات کا آغاز ہوا ۔ اب خواتین کو وقت دیا جا رہا ہے، دوپہر تک یہ سلسلہ چلنا تھا ۔ ہم نے ممتاز علی سے پشاور شہر کی سیر کرنے کی بابت دریافت کیا ۔ انہوں نے اقرار میں سر ہلا دیا ۔ پشاور شہر میں قصہ خوانی گئے ۔ وہاں سے گزر کر مسجد مہابت خان دیکھی ۔ پھر صدر چلے گئے ۔ بازار زیادہ بڑے نہیں، لیکن کچھ اتنا چھوٹے بھی نہیں ۔ صدر میں دکانوں پر ہر طرح کا ملکی اور غیر ملکی سامان دستیاب ۔ وہاں سے پروگرام بنا کہ حیات آباد کے قریب کارخانوں کی مارکیٹ بھی دیکھ ڈالی جائے ۔ یہاں دنیا بھر کی اشیاء ملتی ہیں، ملک بھر سے لوگ آتے ہیں ان چیزوں کو خریدنے ۔ ممتاز بھائی نے کچھ بھی خریدنے سے انکار کیا کہ حیدرآباد میں بھی یہ سب کچھ دستیاب ہے ۔ آپ تو ہمیں چپلی کباب کھلائیں ۔

شام تک یہی مصروفیت رہی ۔ شام کو مراقبہ ہال واپس آئے، تو معلوم ہوا کہ مرشد کریم خطاب کریں گے ۔ لوگ کافی تعداد میں آئے ہوئے تھے ۔ کچھ ان کی دیکھنے ۔

کچھ ان سے اپنے دکھوں کا علاج کرواتے اور کم تھے، جو انہیں سنتے آئے تھے۔ روحانی علاج کے حوالے سے جتنے لوگ میرے مراد سے فیض یاب ہوئے ہیں، ان کے روحانی علوم سے مستفیض ہونے والوں کا تناسب کیا ہوگا؟ ہجوم کے درمیان بیٹھے، مرید نے سوچا اور ذہن میں اپنے مراد ہی کی فرمائی ہوئی بات کوئی ساڑھے گیارہ لاکھ میں سے ایک۔

نیاز احمد عظیمی صاحب نے مرشد کریم کو دعوت خطاب دی، تو انہوں نے وہاں آنے والوں کے ذہنوں کی آبیاری کو، تشنہ روحوں کی سیرابی کو بات کا آغاز تخلیقی نظام سے کیا اور بارش کا پورا نظام اس طرح سے بیان فرمایا کہ پانی کا ذرات میں بدلنا۔ ہوا کا ان ذرات کو اڑا کر لے جانا، ہوا کے دباؤ سے بادلوں کا نچڑ کر برسنا۔ پہاڑوں پر چشموں کا ابلنا۔ برف بننا۔ برف باری ہونا۔ ندی نالوں کا رواں ہونا۔ دریا بننا۔ ڈیم بنا کر نہریں نکال کر اس نظام میں انسانی تصرف کرنا۔۔۔۔ ہر شے کا منظر آنکھوں کے آگے سے گزرتا چلا گیا، یوں لگا ہم بارش سے متعلق پورے نظام کا مشاہدہ کر رہے ہوں۔

پھر انسانی زندگی کے آغاز اور بیج سے پودا بننے کی مثالوں سے واضح فرمایا کہ ہر شے خواہ وہ شہتوت کے بیج جتنی چھوٹی ہو یا انسان جیسے رفیع الشان۔۔۔ ایک واضح سسٹم کے وجہ سے قائم ہے۔

پھر پانی کے قوانین بتاتے ہوئے فرمایا پانی کی فطرت نشیب کے طرف بہنا

ہے ۔آپ سوچیں کہ یہ درختوں میں اپنی فطرت بدل کر کیوں جڑھنا شروع کر دیتا ہے، اور ناریل کے درخت پہ ناریل میں ڈیڑھ گلاس صاف شفاف پانی سو فٹ کی بلندی پر کس حفاظت سے سٹور ہو جاتا ہے، اور وہی پانی ناریل بنتا ہے، جم کر ناریل کی گری بنتا ہے،اس گری میں سے تیل نکلتا ہے، اس گری کے اوپر لکڑی بنتی ہے، اس کے اوپر بالوں کی تہہ بنا کر اس لکڑی کو ٹوٹنے سے بچانے کا اہتمام ہوتا ہے، یہ سب ایک سسٹم کے تحت ہے۔

زمین کے اندر سے تیل، مٹی کا تیل اور پٹرول نکلنا بھی ایک سسٹم کے تحت ہے۔ ایک طرف مٹی درختوں کو نشوونما دیتی ہے، اور دوسری طرف اس کے اندر وہ تیل نکل رہا ہے، جو پودوں کے لئے موت ہے۔

اس سسٹم اور نظام کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ۔آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا، کہ بھیڑ سے بکری یا زرافہ سے اونٹ پیدا ہوا ہو یا اس کے برعکس ہو۔ایک ماں کی آٹھ اولادیں ہوتی ہیں اور ہر ایک دوسرے سے مختلف ۔فرمایا یہ تمام تخلیقی نظام دراصل معین مقداروں کا نظام ہے ۔ان معین ہی کے سبب کبھی سیب کے درخت پر آم نہیں لگیں گے اور آم کے درخت پر کوئی دوسرا پھل ۔جس طرح ایک ماں سے پیدا ہونے والے بچے آپس میں ایک جیسے ہونے کے باوجود مختلف ہوتے ہیں، اسی طرح

ایک ہی زمین سے اگنے والے درخت ایک ہی نظام کے تحت پلنے والے پودے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کیا شان ہے کہ زمین ایک۔ پانی وہی، ہوا ایک، لیکن ہر شاخ دوسری سے مختلف۔ صرف آم ہی کی دوسو سے زائد اقسام بتائی جاتی ہیں۔

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے یہ تخلیقی نظام اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتے، جب تک ان کو ایک واحد ہستی کنٹرول نہ کر رہی ہو۔ سسٹم کی تعریف یہ ہے کہ اس میں ٹکراؤ اور الجھاؤ نہ ہو۔ ایک سسٹم دوسرے سسٹم کی خدمت سے، اس کے ساتھ تعاون سے انکار نہیں کرتا۔ کر ہی نہیں سکتا۔ اس پورے سسٹم میں بے شمار مخلوقات ہیں، جو اس سسٹم بنانے والے کی محتاج ہیں۔ مخلوق کی زندگی کا ہر لمحہ اللہ کا محتاج ہے، اللہ کی ذات ذی احتیاج نہیں۔ لیکن ہر سسٹم کی ایک چیز دوسری چیز کی محتاج ہے۔

اس نظام کو بنا کر اللہ نے ایک اور نظام بھی تخلیق کیا۔ یعنی وسائل کی تقسیم کا نظام۔ اور اس نظام کو کنٹرول کرنے کا چارج اس ہستی کو دیا جسے رحمت اللعالمین کا خطاب دیا۔ یعنی ایک ایسی ہستی جو وسائل کو اپنی رحمت سے تقسیم کرے۔ اللہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس لئے پیدا کیا کہ وسائل کی تقسیم کے ساتھ نظام کو جاری و ساری رکھا جائے۔ اگر تقسیم میں رحمت شامل نہ ہو تو بے شمار لوگ محروم رہ جائیں۔ محبت نہ ہو تو سسٹم میں

سے پیدا فرمایا۔

اللہ تعالیٰ تمام عالمین کے رب ہیں۔ ان کو وسائل فراہم کرتے ہیں، سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان وسائل کو تقسیم کرتے ہیں۔ تقسیم کے اس سسٹم کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ میں نے اپنے مرشد حضور قلندر بابا اولیاؒ سے اس سسٹم کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ سب سے پہلے نور پیدا ہوا۔ پھر حرکت پیدا ہوئی۔ بجلی ہائی ٹینشن تاروں میں چلتی ہے، اگر گرڈ اسٹیشن نہ ہوں ٹرانسفارمر نہ ہوں، تو سب کچھ جل جائے۔ حضورؐ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کی طاقت کو اپنے ذہن پر برداشت کر کے اس کو عالمین میں اس طرح پھیلاتے ہیں کہ ہر سسٹم کو اس کی ضرورت کے مطابق ان تجلیات کی طاقت مہیا ہوتی رہے۔

مقام محمود کائنات اور اللہ کے درمیان ایک پردہ ہے، یہ پردہ حضورؐ کی ذات اقدس ہے۔ جب اللہ کن فرماتے ہیں اور تخلیقی لہریں اللہ کے ذہن سے نکل کر مقام محمود پر آتی ہیں، تو انؐ کی رحمت سے ٹھنڈی ہو کر کائنات میں پھیل جاتی ہیں، ہم خوش قسمت ہیں کہ حضورؐ کے امتی ہیں۔ ہم اتنے مقرب بندے کی امت ہیں۔ جس سے اللہ نے قربت میں کوئی فاصلہ نہیں رکھا۔ قاب قوسین کہہ کر خالق اور مخلوق کی حد بندی اور رشتے کو الگ الگ کر دیا۔ یعنی یوں تو فاصلہ نہیں رہا مگر خالق خالق رہا اور مخلوق مخلوق رہی۔ باپ

بیٹے کو سینے سے لگا کر بھینچنے کے باوجود باپ باپ رہا اور بیٹا بیٹا رہا۔ یعنی اللہ نے اپنے بندے سے پیار کیا۔ اپنے سینے سے لگایا، اس سے راز و نیاز کیا، پھر کہا یہ کوئی خواب و خیال کی بات نہیں۔ اس نے جو دیکھا سچ دیکھا۔ ہم اتنے مقرب بندے کی امت ہونے کے باوجود ۔۔۔ جس کی وجہ سے ساری کائنات تخلیق ہوئی ۔۔۔ ہر وہ کام کرتے ہیں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔ یہ پٹھان ہے۔ یہ سندھی ہے۔ یہ پنڈی کا ہے۔ یہ پشاور کا ہے۔ ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ گو کا گلا کاٹ رہا ہے۔ حکم یہ کہ آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ لیکن ہم میں سے کوئی بریلوی ہے، کوئی دیوبندی۔ ہم نہ اللہ کی بات مانتے ہیں اور نہ رسولﷺ کی۔ ہم ہر وہ بات کرتے ہیں، جو کہ حضور ﷺ کو ناپسند ہے۔

اپنا انگلینڈ کا ایک واقعہ سنایا کہ ایک انگریز آیا، اور اس نے کہا، میں مسلمان ہونا تو چاہتا ہوں، مگر آپ یہ بتائیں کہ آپ مجھے کون سا مسلمان بنائیں گے۔ فرمایا کیا یہ باتیں حضور اکرم ﷺ کے مزاج پر گراں نہ گزرتی ہوں گی۔

ہمارے اسلاف جب تک نورِ نبوت سے سیراب رہے۔ وہ فتوحات پہ قادر رہے۔ اور جب سے مسلمانوں کو موت سے خوف آنے لگا، یعنی وہ اللہ کے پاس جانے سے ڈرنے لگے، وہ اللہ جس نے آپ کو پیدا کیا، زمین کو دسترخوان بنا دیا، اس اللہ سے

ملنے کا وقت آتا ہے تو ہم ڈرنے لگتے ہیں، ہم بتا نہیں ہوں گے تو کیا ہوں گے۔ آپ موت سے کتنا بھاگیں گے۔ یہ سسٹم کا حصہ ہے، جو پیدا ہوا ہے، اس کو مرنا تو ضرور ہے۔ ہم قرآن کی آیات کو بھی نہیں پڑھتے۔ پڑھتے ہیں، تو غور نہیں کرتے۔ روح کی تلاش نہیں کرتے۔

تمام روحانی سلسلوں کی تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ انسان کسی طرح اپنی روح سے واقف ہو جائے اور ایسی نمازیں نہ پڑھے، جو ویل المصلین کے ضمن میں آتی ہوں اور ہمارے لئے ہلاکت کا سبب بنتی ہوں۔ ہم کیوں وظائف اور اذکار کے باوجود مطمئن نہیں۔ کیوں ہمارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوتا، خوف اور غم سے نجات کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی روح سے واقف ہوں۔

روح سے واقفیت کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر اتر جائیں، اور اپنے اندر اترنے کے لئے ہمیں مراقبہ کرنا ہوتا ہے، مراقبہ کرنے کا مطلب ہے، بندہ اپنے اندر ڈوب جائے۔ نماز جسمانی سعادت ہے، اس سعادت کے ساتھ ساتھ قلوب میں ایمان داخل ہونا بھی ضروری ہے۔ ایمان اس لئے ضروری ہے کہ جسمانی آنکھ اللہ کو نہیں دیکھ سکتی۔ نور اول باعث تخلیق کائنات ؐ کو نہیں دیکھ سکتی۔ ان ؐ کو دیکھنے کے لئے ہمیں روحانی آنکھ کا استعمال کرنا آنا لازم ہے۔ اس کے لئے ہمیں صرف اتنا کرنا ہے کہ ہم

اپنے اندر دیکھیں۔ اندر دیکھیں گے تو اس روح کو دیکھیں گے، جس روح نے اللہ کو دیکھا ہوا ہے۔

آپ پانچ ہزار واٹ کا بلب دیکھنا چاہتے ہیں، تو آپ کو اس کی پریکٹس چاہیے، پہلی دفعہ دیکھنے پر اگر حضرت موسیٰ برداشت نہیں کر سکے، تو اس کا یہ مطلب کب ہوا کہ دوسری دفعہ بعد میں بھی انہوں نے نہیں دیکھا۔ نہ دیکھا ہوتا تو وہ اللہ سے ہم کلام کیسے ہوتے۔ توریت کیسے نازل ہوئی۔

انسان کا مادی جسم روح کے بغیر مردہ جسم ہے، روح کا جسم ہی اصل ہے۔ یہ مادی جسم اس کی نقل ہے۔ اصل نہ ہو تو نہ بیوی ہو سکتی ہے، نہ بچے اور نہ ہی کوئی رشتہ۔ انسان نقل کو ہی سب کچھ سمجھ رہا ہے اور اس نے اصل کو نظر انداز کیا ہوا، جب آپ نے نقل کو اصل سمجھ لیا ہے تو آپ پریشان ہی ہوں گے۔ نقل کی خاطر ہم نے اصل کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ یہ جسمانی گوشت پوست کے بدن اور مادیت کو اصل سمجھنے والے ہی اصل گھاٹے اور خسارے میں ہیں۔ نقل کو نقل رہنے دیں۔ اصل کو پہچانیں۔''

****

خطاب سن کر ہم اٹھ کر مراقبہ ہال سے باہر آگئے اور مرشد کریم لوگوں سے ملنے جلنے میں مصروف ہوگئے۔ رات ہونے پر فراغت سی ہوئی تو نیاز صاحب نے پارک جانے کی اطلاع دی۔ خواتین کے ساتھ جاتے دیکھ کر مرید نے اپنے مراد کے ذہنوں کی کجی دور کردینے والے اثر کی بابت سوچا۔ صوبہ سرحد میں پردے کے نام پر عورتوں کو حبس بے جا میں رکھا جاتا ہے۔ لیکن مرشد کریم عورتوں کی مدد کو یہاں بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ سلسلہ عالیہ عظیمیہ میں داخل ہونے والے ہر مرد کے ذہن میں یہ بات واضح طور پر نقش کردی گئی ہے کہ روحانی طور پر ہر عورت بھی اتنی ہی طاقت ور اور جیسم ہے جتنا کوئی مرد ہوسکتا ہے اور یہ کہ اگلا دور آنے والا وقت عورتوں کی حکمرانی کا دور ہوگا۔ ایک بار ایک بھائی نے خواتین کے پردے کی بابت پوچھا۔ آپ نے جواب میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ’’آپ اسلامی پردے کی بابت پوچھ رہے ہیں یا پٹھانوں کے پردے کی بابت۔‘‘ جواب میں وہ اپنے تعصب کی تصدیق کرنے کو حوصلہ کہاں سے

لاتے۔ کھسیانے سے ہوکر بولے۔ ''جی، اسلامی پردے کے بارے میں۔''

فرمایا۔ عرب میں، مکہ میں، خانہ کعبہ میں، حج کے دوران جو پردہ کیا جاتا ہے

۔اس سے بہتر مثال کیا ہوگی آپ کے پاس تقلید کے لئے ۔ پھر قدرے توقف کے بعد کہا

۔'' آپ کا دھیان ہی کب ہوتا ہے، کسی اور طرف!'' اب اس طرف سے مراد خانہ کعبہ تھا

یا خواتین ۔ وہاں موجود لوگوں نے اپنے اپنے ذہنوں کے مطابق اپنی اپنی رسائی اور

ذوق کے مطابق بات کو سنا اور لطف لیا ۔

مرشد کریم تشریف لاتے ہیں تو سلسلے کے مرد وزن اپنے مرشد کے گرد یوں

اکٹھے ہو جاتے ہیں جیسے ایک خاندان کے افراد اپنے والد کے گرد جمع ہو جاتے ہیں ۔اس

وقت سب کا دھیان ایک ہی بندے کی طرف ہوتا ہے اس بندے کی طرف جس کی

قربت میں دنیا کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے ۔ذہن پرسکون اور روح شاد ہو جاتی ہے ۔

سلسلے کے سب بہن بھائی انہیں کہتے بھی تو ابا جی ہیں ۔ ابا، ابا جی یا حضور ابا

جی ۔ کچھ بہن بھائی انہیں بابا جی بھی کہہ لیتے ہیں ۔اس لفظ کو کہتے ہوئے جس طرح سے

باپ کی شفقت کا ایک گہرا احساس کہنے والے کے ذہن پر مرتب ہوتا ہے اسی طرح ایک

احترام اور عقیدت کی کیفیت بھی مرتسم ہوتی ہے ۔

پارک جاتے ہوئے صوبہ سرحد اور پشاور کی سڑکوں کی تعریف کی ۔ یونیورسٹی

روڈ سے گزرتے ہوئے فرمایا۔ ’’لگتا ہی نہیں کہ ہم پاکستان میں ہیں، یوں لگتا ہے یورپ کے کسی شہر سے گزر رہے ہیں۔‘‘ مرید نے سوچا شاید یہ بات انہوں نے پشاور کو خوش کرنے کو کہی ہے۔ شہر بھی تو ایک جسم ایک وجود رکھتے ہیں۔ ہر شہر کے اپنے نقوش اور خدوخال ہوتے ہیں۔ اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے لے کر پیرس نیویارک لندن ٹوکیو بنکاک جیسے شہروں کا سوچ کر دیکھ لیں۔ ہر شہر کی کیفیات دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ بعض شہروں میں تو وسوسے بالکل ہی نہیں آتے اور بعض شہر تو اپنی مخصوص فضا کے سبب پہچانے جاتے ہیں۔ ہر شہر کا اپنا ایک جداگانہ و منفرد تشخص ہوتا ہے۔

پارک میں ادھر ادھر گھومنے کے بعد میر امراد پھولوں کے ایک کنج کے قریب بیٹھ گیا۔ سب نے گھیرا ڈالا۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ مرید نے مراد کو دیکھا۔ مراد آسمان کی طرف طلوع ہوتے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ مرید کے ذہن میں بچپن کی یادوں کا ایک ریلا گزرتا چلا گیا۔ گاؤں میں چاندنی راتوں میں بچے دائرے میں بیٹھ کر کوکلا چھپاکی جمعرات آئی اے۔ گاتے پیچھے مڑ کر دیکھنے والوں کو کپڑے کے مروڑا دے کر بنائے ہوئے کوڑے سے مارا کرتے اور جو اپنے پیچھے رکھے کوڑے کو محسوس کرتے میں ناکام رہتا وہ چور بنتا اور مار کھاتا۔ اس کھیل کا مقصد بھی حسیات کو تیز کرنا ہی ہوتا ہوگا تا کہ آپ

گردن موڑے بغیر پیچھے رکھے جانے والے کپڑے کے کوڑے کی موجودگی محسوس کر سکیں۔ ساری بات ہی محسوسات کی ہے۔ انسان میں احساسات دور کرنا بند کر دیں تو وہ زندگی سے دور ہو جاتا ہے۔ بے حسی اور موت میں یہی تو ہوتا ہے۔ بے حسی میں احساسات ختم ہو جاتے ہیں۔ موت میں احساسات بڑھ جاتے ہیں۔ میرے اندر کوئی بولا۔ دات کے حواس بڑھ کر موت کے حواس میں ڈھل جاتے ہیں تو بندہ اس دنیا سے کسی اور عالم کسی اور جہاں میں منتقل ہو جاتا ہے۔

یہ ساری تیاری ہی اگلے جہاں کے لئے ہے یہاں کی زندگی میں تو ساری توانائی خوش رہنے اور تکلیفوں سے بچنے کی جدوجہد میں ہی خرچ ہو جاتی ہے۔

مراد نے مرید کو سوچ کی لہر کے جواب میں کہا۔ ''خوش رہنے والے دنیا چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ ابراہیم بن ادھم اور بدھا نے یہی تو کیا۔ جب انہیں پتہ چل گیا کہ خوشی کیا ہے تو انہوں نے بادشاہت چھوڑ دی۔ ادھم نے بادشاہت چھوڑی اور دریا کنارے جھونپڑی ڈال کر بیٹھ گئے۔ بدھا کے بارے میں اس کی پیدائش کے وقت یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ اگر اس نے ناخوشی دیکھ لی تو وہ دنیا چھوڑ جائے گا۔ اس کے باپ نے یہ انتظام کیا کہ وہ ناخوشی کا کوئی منظر نہ دیکھ سکے لیکن آخر جب اس نے دیکھ لیا تو وہ سچی خوشی کے مفہوم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ خوشی جنت سے دوری ہے اور یہ

دوری ہی تو اس کو ختم کرنا تھی۔"

"اللہ نے بھی کیا خوب انتظامات کئے۔ پہلے اس کو ناخوشی سے دور رکھا۔ اگر دور نہ رکھتے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا عادی ہی ہو جاتا۔ اللہ بہت ہی بڑے ہیں اب یہ دیکھیں کہ موسیٰ کو فرعون کے ہاں پرورش کروا دیا۔ اس سے ہوا یہ کہ موسیٰ کے دل سے بادشاہ اور حکومت کا خوف نکل گیا۔ خوف بھی نہ رہا۔ لالچ بھی نہ رہا۔"

بات کہنے کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ الوہی انتظام کا ایک خاکہ سا ذہن سے گزرتا چلا گیا۔ یہ سارا انتظام بندے کو اس طرف راغب کرنے ہی کا ہوا نہ اور جب بندہ راغب ہو جائے تو جلوؤں کے سمندر پار جا کر یہ رفیق اعلیٰ کی تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ اس تمنا کا سا خشانہ قربت الٰہی کا وہ کونسا مقام ہوگا جو قاب قوسین سے بھی سیری نہ ہو سکی۔ یہ بات ذہن میں آئی اور سوال بن گئی۔ مرید نے پوچھا۔ "رفیق اعلیٰ سے مراد اعلیٰ ترین قسم کی رفاقت ہوئی اس رفاقت کی بھلا کیا نوعیت ہوگی؟

فرمایا۔ "جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں جب آپ نے ایک چیز کو دیکھ لیا تو وہ ابعاد یعنی Dimens ons میں آ گئی۔ اللہ کو قاب قوسین کے مقام یا حالت پر دیکھ لینے کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے اس روپ کے متمنی تھے جو حدود سے ماورا یعنی Dimension less تھا۔" اختصار کلام کی خوبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں

نے اس سوال کا جواب دو ہی جملوں میں مکمل کر دیا جس کی بابت ایک طویل تقریر متوقع تھی۔

ذہن میں سکوت کا ایک وقفہ حیرت اور استعجاب کی علامت بن گیا۔ پھر کئی باتیں یکدم ذہن میں آئیں اور گڈمڈ ہو گئیں۔ ہم ان گڈمڈ ہوتی کیوں اور کیسی والی باتوں کا سرا ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ فرمانا شروع کیا۔

''انسان صبر نہیں کرتا۔ حالانکہ اللہ نے صاف کہا ہے ان اللہ مع الصابرین یعنی اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور صبر نہ کرنے والوں کے ساتھ نہیں۔ یعنی آپ جلد بازی کرتے ہیں تو اللہ آپ سے دور ہٹ جاتا ہے۔ ہر کام ایک سسٹم کے تحت ہوتا ہے۔ بندہ خود اٹھارہ سال میں جوان ہوتا ہے اور جوان ہو کر کہتا ہے کہ میرا کام ابھی ہو جائے۔ بھئی کیسے ہو جائے۔ خود تم اٹھارہ کی بجائے دو ہی سال میں جوان ہو جاتے تو جو کام سال میں ہونا چاہیے وہ ایک مہینے میں ہو جائے۔ انسان بلاشبہ ظالم ہے جاہل ہے اور جلد باز ہے اور اس کا نقصان بھی خود اسی کو ہے۔ آپ غصہ کرتے ہیں آپ کی عمر کم ہو جاتی ہے۔ نقصان کس کا ہوا۔ یہ خود پر ظلم ہی تو ہوا نا۔''

''اللہ میاں کو کبھی کسی ولی نے غصے یا جلال کی حالت میں نہیں دیکھا۔ باطنی طور پر جب بھی دیکھا۔ باپ کی، پیار کرنے والے کی یا مرشد کی صورت میں ہی دیکھا۔

کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ اللہ میاں غصے میں تھے۔ پھر یہ اللہ سے ڈرنے کا چکر نہ جانے کہاں چل گیا ہے۔''

خواتین کے ہمراہ بچے بھی تھے۔ بچے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہوئے فرمایا۔'' بچے کے اندر ایک جوان آدمی چھپا ہوتا ہے۔'' اور کہا۔'' بھئی ان بچوں کو آئس کریم کھلا دیجئے۔'' یہ کہہ کر جیب سے کچھ رقم نکال کر نیاز صاحب کو دی۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور زبیر عزیز کو متوجہ اور مستعد پا کر آئس کریم مہیا کرنے کی ذمہ داری ان کے حوالے کر دی۔ وہ پارک میں موجود سٹال کی طرف گئے۔

ایک صاحب نے عورت کے آدم کی پسلی سے بننے کا تذکرہ کیا۔ اس پر فرمایا۔'' عورت کے بارے میں یہ یونہی کہا گیا ہے تا کہ عورت کی توہین کی جا سکے کیونکہ پسلی ٹیڑھی ہوتی ہے۔'' اپنے قریب آنے والوں کے افکار میں ہر الجھاوے کو دور اور ہر ٹیڑھے پن کو سیدھا کرنا انہوں نے خود پر جیسے فرض کر لیا ہے۔ یہ اتنا بڑا معاملہ کیسے چھوڑ دیتے۔ کہا'' مردوں نے عورتوں پر بہت ظلم کئے ہیں۔ انہیں زندہ گاڑا۔ سر بازار خریدا اور بیچا۔ حالانکہ عورت ہی نے پیغمبروں اور ولیوں کو جنم دیا۔'' دراصل اللہ نے ہر شے دو رخوں پر پیدا کی ہے۔ جب آدم اپنے اندر دیکھتا تھا تو اس کو اپنا باطنی رخ'' عورت'' یعنی چھپا ہوا رخ نظر آتا تھا۔ آدم نے اللہ کے دیے ہوئے اختیار سے اس باطنی رخ کو ظاہر کر

دیا اور یہ رخ عورت کہلایا۔ اس وقت مرید کے ذہن میں جانے کہاں سے فر والے دستانے کا تصور آ گیا۔ شاید ان کے ہاتھ کے اشارے سے یا ان کے روحانی تصرف کے تحت مرید نے عرض کی۔ ''جیسے فر والے دستانے کو الٹ دیا جائے تو بالوں والی سطح اندر چلی جاتی ہے اور اندر والی چھپی ہوئی سطح باہر آ جاتی ہے۔ اس طرح؟''

فرمایا۔ ''جی ہاں۔ اسی طرح۔ عورت میں باطنی رخ مرد ہو گیا اور یہی ان دونوں کے درمیان کشش کا سبب ہے۔''

تھوڑی دیر بعد ایک اور سوال ہوا۔ ''حضور لیکن عورتوں کو نبوت تو نہیں ملی نا؟''

فرمایا۔ ''جی ہاں۔ عورتوں کو رسالت نہیں ملی۔ نبوت تو ملی۔ عورتوں کو بھی نبوت عطا کی گئی تھی جیسے حضرت مریم کو۔ دراصل عورت کی جسمانی ساخت رسالت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ رسالت اور نبوت کے علوم میں فرق ہے۔''

اتنے میں زبیر عزیز نے آ کر اطلاع دی کہ یہاں آئس کریم دستیاب نہیں ہے اس پر فرمایا کہ واپسی پر راستے میں آئس کریم خرید یں اور مراقبہ ہال جا کر ان کو کھلائیں۔

واپسی کے لئے اٹھے تو چاند بادلوں کو منور کرنے ان کی اوٹ لے چکا تھا۔
بادلوں کو دیکھتے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے پھولوں بھرکھیت ہوں۔مرید نے مراد کے
ہمراہ قدم اٹھاتے ہوئے علم لدنی کی بابت کچھ جاننے کی خواہش کا اظہار کیا۔اس پر
فرمایا۔ ’’علم لدنی کے چھیالیس ابواب ہیں۔ہر نبی ان میں سے کچھ ابواب پڑھتا
ہے۔انہی کی بناء پر ان کے درجات کا تعین ہوتا ہے۔اسی بناپر یہ کہا گیا ہے کہ بعض نبیوں
کو بعضوں پر فضیلت دی گئی ہے۔تکوین کے بندوں اور پیغمبروں میں اس لحاظ سے تو کوئی
فرق نہیں ہوتا کہ دونوں ایک ہی کورس پڑھتے ہیں۔فرق صرف تقرری اور چناؤ کا ہوتا
ہے۔جیسے تمام MBBS کرنے والے ڈاکٹر ہوتے ہیں مگر سول سرجن وہی ہوتا ہے
جس کو ایک اختیار کے تحت مقرر کیا گیا ہو۔

’’قرآن میں چھبیس انبیاء کا تذکرہ ہے ہر نبی کسی نہ کسی ایک باب میں خاص
مہارت رکھتے ہیں۔جیسے حضرت یوسف خوابوں کے بارے میں،لقمان حکمت کے
بارے میں،سلیمان تسخیر کے بارے میں۔۔۔‘‘

’’حضرت یوسف کے بھائی بھی پیغمبر تھے لیکن انہوں نے اس علم کے کم
ابواب پڑھے تھے۔رمل،جعفر،فلکیات اور علم سیا مگان بھی اسی علم کے ابواب ہیں۔
خواب چالیسواں باب ہے۔حضرت موسیٰ کے قصے میں جس بندے کا تذکرہ کیا گیا

ہے ۔وہ حضرت موسیٰ سے زیادہ ابواب کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ اسی لئے تو حضرت موسیٰ اس کے پاس گئے تھے ۔

یہ کہتے کہتے پارکنگ میں پہنچ گئے ۔ وہاں سے گاڑیوں میں سوار ہو کر مراقبہ ہال پہنچے ۔ مراقبہ ہال میں آئس کریم کھاتے ہوئے مجھے کچھ یوں لگا جیسے یہ منظر وہ اس سے پیشتر بھی کہیں دیکھ چکا ہے ۔ سوچنے کے باوجود کوئی سرا نہ ملا ۔ اس نے مرشد کی طرف دیکھا ۔ انہوں نے میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب کا تذکرہ کیا ۔"وہ بہت مہمان نواز ہیں ۔لوگ لاہور جاتے ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں ۔" اس کے ساتھ ہی وہ پورا منظر حافظے میں ابھر آیا ۔ ہم لاہور میں اپنے مراد کے ہمراہ پھولوں کی نمائش دیکھ کر واپس آ رہے تھے تو مراد نے اصرار کر کے بچوں کے لئے آئس کریم خریدی تھی اور وہ ہم نے لاہور مراقبہ ہال کے سبزہ زار لان پر بیٹھ کر اس وقت کھائی تھی جب رات ڈھلے اوس قطرے بن کر ٹپک رہی تھی اور آئس کریم کھاتے ہوئے مریدوں کو مراد بتا رہا تھا کہ دائرے سے مراد وہ حرکت ہے جو لگاتار جاری رہے اور مثلث سے مراد وہ حرکت ہے، جو ایک خاص فاصلے کے بعد رخ بدل لے ۔ واہمہ سے خیال، خیال سے تصور اور پھر مادی وجود یہ سب مثلث کی حرکات ہیں کیونکہ ان میں رخ بدلنے سے زاویے پیدا ہوئے ۔ انسان مثلث کی مخلوق ہے ۔ مثلث کی وجہ سے اس کی سکت زیادہ ہوتی ہے اور

اس لئے جب وہ دائرے میں داخل ہوتا ہے تو باقی سب دائروں سے آگے نکل جاتا ہے۔ آپ دائرے کو کاٹیں۔ باقی مثلث رہی۔ جنات دائرے کی مخلوق ہیں اور انسان مثلث کی۔ مثلث درحقیقت ڈائمینشن اور حدود کا نام ہے۔''

نیاز صاحب نے میاں صاحب کے تذکرے پر ان کی محنتی اور کارکن ہونے کی بات کی اس پر فرمایا۔ ''آپ ان کو کوئی کام کہہ دیں پھر دیکھیں وہ اکیلے ہی اس کو کر ڈالیں گے آدمی تو وہ سنگل پسلی کے ہیں مگر کام بڑے بڑے کر ڈالتے ہیں۔''

''اب تو کوئی مجھے زندگی کی دعا کے لئے کہتا ہے تو مجھے عجیب سا لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے اپنی قید میں اضافے کی درخواست کرنے کو کہہ رہا ہو۔'' نیاز صاحب کو مخاطب کر کے ہمیں آئندہ زندگی کی تیاری کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''حالانکہ اوپر عالم اعراف کی زندگی، اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگوں کے لئے یہاں کی زندگی سے بہرحال بہت بہتر ہے۔ وقت پر کھانا ملتا ہے۔ گھنٹی بجتی ہے سب آکر اپنا اپنا کھانا لے کر کھا لیتے ہیں۔ نہ پکانے کے جھنجھٹ نہ برتن صاف کرنے کا مسئلہ۔ کپڑے بھی وہاں تیار مل جاتے ہیں۔ رہنے کو جگہ بھی مل ہی جاتی ہے۔''

''یہاں پر جو بچے فوت ہو جاتے ہیں۔ وہاں وہ جوان ہوتے ہیں۔ ان کی شادیاں ہوتی ہیں۔ یہ شادیاں وہاں اوپر والوں کے لئے اجتماعی خوشی بن جاتی ہے۔

سب اس میں شریک ہوتے ہیں ۔وہاں اور کوئی مصروفیت بھی تو نہیں ۔ ادھر چلے گئے ادھر چلے گئے ۔اس سے مل لیا ۔اُس سے مل لیا۔ بعض سیارے ایسے ہیں جہاں پر انسان جاسکتا ہے۔وہاں چلے گئے ۔ یہ ان کی پکنک ہوگئی۔ البتہ تکوین کا کام کرنے والوں کو وہاں بہت کام کرنا ہوتا ہے۔کان کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی ۔''

صبح نماز اور مراقبہ کے بعد درس میں قرآن حکیم کی آیت ''ختم اللہ علی قلب ہم ۔۔۔'' کی شرح فرماتے ہوئے بتایا کہ اللہ تعالیٰ مہر کر دیتے ہیں کا جو مطلب ہم لیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ مہر کر دیتا ہے ۔ جب اللہ نے مہر کر دی تو پھر بھلا بندے کا کیا قصور ہوا۔ پھر اس کو عذاب الیم کس بات کا۔ پھر اس کی تفصیل فرماتے ہوئے بتایا کہ قلب کے بعد نفس کی کیفیت ہوتی ہے۔قلب میں اللہ کی طرف سے موصولہ اطلاعات اور نفس میں بندے کی مرضی اور اختیار کی روشنی میں ان اطلاعات میں معنی پہنانے کا عمل ہوتا ہے۔ جب بندہ کسی برائی کو اختیار کرتا ہے تو ضمیر جس کو حضور قلندر بابا اولیاؒ نے نور باطن فرمایا ہے بندے کی راہنمائی کو اس کو ٹوکتا اور منع کرتا ہے۔کئی بار ایسے ہونے کے بعد جب آدمی اپنی بات پر اڑ جاتا ہے اور برائی کو اختیار کرنے کا عہد کر لیتا ہے تو فرشتے یہ بات اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کر دیتے ہیں ۔اس پر اللہ آدمی کے کئے ہوئے عہد پر کاؤنٹر سائن Counter Sing کر دیتے ہیں اور اب اس آدمی پر اس کی اختیار کی ہوئی برائی

مسلط ہو جاتی ہے اس کے کانوں اور آنکھوں پر ایسا پردہ پڑ جاتا ہے کہ وہ ہر بات کو اسی برائی کے حوالے سے سنتا اور دیکھتا ہے۔ اسی برائی کے اختیار کرنے، اس پر قائم ہونے، ضمیر کی ہدایت کو نظر انداز کرنے پر سزا ملتی ہے اور یہ یاد رکھیں کہ اللہ کسی کو سزا نہیں دیتا۔ آدمی اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کی پکڑ میں آ جاتے ہیں اور یہی ان کی سزا ہوتی ہے۔"

ایک صاحب نے ایک بہت ہی عجیب سا سوال کیا۔ یہ سوال اس سے پیشتر کشمیر میں پوچھا گیا تھا اور پھر سوات میں بھی۔ تینوں جگہ سوال ایک ہی تھا کہ جب یہ بتایا جاتا ہے کہ روحانی صلاحیتیں رکھنے والے کے پاس تکوینی انتظامات تک کا اختیار آ جاتا ہے تو پھر وہ لوگ اس دنیا کے نظام کو ٹھیک کیوں نہیں کر دیتے؟

کشمیر میں اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔ "روحانی بندہ ایک چھتری کی چھاؤں میں کھڑا ہوتا ہے اس کو کیا پڑی ہے کہ وہ چھاؤں چھوڑ کر دھوپ میں نکلے اور پھر آگ میں گھس کر لوگوں کو پکڑ کر زبردستی نکالنے کی کوشش کرے۔ وہ آواز دیتا ہے کہ آؤ میرے قریب آ جاؤ۔ تم بھی چھاؤں میں آ جاؤ اب چھاؤں اٹھا کر تو آگ میں گھسنا بیکار سی بات ہی ہے۔"

سوات میں اس کا جواب یہ تھا کہ روحانی لوگ جن کو اللہ تعالیٰ اختیارات سے نوازتے ہیں ان کو عطا کردہ اختیارات کے استعمال کی سمجھ اور سوجھ بوجھ بھی عطا

کرتے ہیں ۔وہ ان اختیارات کو اللہ کے قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے استعمال کرنے کے پابند ہوتے ہیں ۔

وہ اللہ کے قوانین کو آپ سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں ۔اس لئے وہ اچھے کام میں تو آپ کی مدد کرتے ہیں مگر برے کاموں میں نہیں ۔اب یورپی اقوام کے افراد جو ایجادات کرتے ہیں تو آپ کا کیا خیال ہے وہ ایسے لوگوں کی امداد اور تصرف کے بغیر ہی ہو جاتی ہیں ۔وہ چونکہ اس کے اہل ہوتے ہیں اس لئے ان کی مدد کی جاتی ہے ۔ آپ اہلیت نہیں رکھتے اس لئے آپ کی مدد بھی نہیں ہوتی ۔"

'' آپ تو ہر کام کے لئے حکومتوں سے توقع رکھتے ہیں ۔حکومتوں سے توقع نہ رکھیں ۔اپنی چھوٹی چھوٹی تنظیمیں بنالیں اور مل جل کر ایجادات کریں ۔حکومتوں نے تو ایجادات کرنے والوں کے راستے میں ہمیشہ روڑے ہی اٹکائے ہیں بلکہ پہلے تو وہ سزا دے دیا کرتے تھے ۔گلیلیو کو تو پھانسی کا حکم دیا کہ اس نے دوربین کیوں بنائی ۔بھئی حکومت کو کیا پڑی ہے کہ آپ کی مدد کرے ۔آپ کوئی ایجاد کر لیں مل جل کر کوشش کریں جب وہ کامیاب ہو جائے گی تو حکومت سے گرانٹ مانگ لیں ۔گرانٹ ملے نہ ملے ٹیکس تو لگ ہی جائے گا ۔آپ تو اپنے گھروں کے کوڑا کرکٹ کی صفائی تک کے لئے حکومت کی طرف دیکھتے ہیں جو کام آپ کے کرنے کے ہیں وہ سب آپ کو خود ہی کرنے

چاہئیں۔"

اور اب ہم منتظر تھے کہ دیکھیں ان سابقہ دیئے گئے دونوں جوابوں میں سے کونسا دہرایا جاتا ہے مگر جواب سن کر اتنا سمجھ میں آگیا کہ وہ بات ہمیشہ مخاطب کے ذہن ،اس کی سوچوں اور اس کی سمت کے مطابق دیتے ہیں ۔جس کے ذہن میں جیسے خیالات ہوتے ہیں اس کو انہی خیالات کے مطابق جواب ملتا ہے۔ مخاطب کی Approach کو سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا جاتا ہے تو اس کی اثر پذیری میں تو اضافہ ہوتا ہی ہے اس سے ہمیں اپنے مراد کی رسائی کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے۔فرمایا

"بھئی وہ قرآن میں ہے نا "لا اکراہ فی الدین" دین سے مراد مذہب ہی نہیں بلکہ نظام اور سسٹم بھی لیں تو اس کا مطلب ہے کہ کسی بھی نظام میں زبردستی نہیں ہے اور جب یہ بھی طے ہو کہ اللہ کبھی اس کی حالت نہیں بدلتے جو خود آپ اپنی حالت بدلنے کی خواہش نہ رکھتے ہوں تو آپ خود دیکھ لیں کہ اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ آپ کی حالت بدلنے کے لئے اپنے بندوں کو مامور کریں۔وہ بندے اپنی مرضی سے تو کچھ کرتے نہیں جیسا اللہ چاہتا ہے ویسا ہی کرتے ہیں۔"

ایک مرید نے سوال کیا۔تذکرہ قلندر بابا اولیاؒ میں صاحب مجاز افراد کے ضمن میں عبید اللہ صاحب کا جو ذکر کیا گیا ہے کیا وہ یہ پشاور والے عبید اللہ درانی صاحب ہی

تھے؟ فرمایا۔ ''جی ہاں'' اس پر مرید نے عرض کی کہ انہوں نے سلسلہ عالیہ کے لئے کیا کیا؟ فرمایا۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے انہیں تکوین میں لیا تھا۔ ایک دوسری نشست میں فرمایا۔ '' درانی صاحب تو روحانی باتیں تک نہیں کیا کرتے تھے۔ اکثر خاموش رہتے تھے۔ جب کبھی میں ان سے ملنے جاتا تو ان کے مرید خوش ہوتے کہ جب حضرت عظیمی صاحب آتے ہیں تو ہمارے مرشد ہنستے ہیں۔ وہ بہت پیار کرتے تھے سلسلے سے۔ جب بھی کراچی آنا ہوتا۔ چند منٹ کے لئے ہی سہی مجھ سے ملنے ضرور آتے۔ ان کے ایک مرید تھے پطرس اور ایک مرید تھے۔ مائیکل صاحب روحانی آدمی تھے۔ قادر نگر کا انتظام انہی نے سنبھالا ہوا تھا۔ درانی صاحب نے خود تو اتنا کچھ لکھا بھی نہیں صرف ''حیات قادر'' ان کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ باقی اگر کچھ لکھوایا بھی تو ولی الدین صاحب سے۔''

اس پر مرید نے ''روحوں سے گفتگو'' نامی کتاب کا تذکرہ کیا کہ درانی بابا نے اس کا دیباچہ لکھا اور بات روحیں بلانے اور ان سے گفتگو کے بارے میں شروع ہو گئی۔ نیاز صاحب نے کہا کہ یہ گفتگو درحقیقت روح سے نہیں ہوتی بلکہ بلائی جانے والی روح کا ایک آدھ پرت جو یہاں پیچھے رہ جاتا ہے۔ وہ ان قسم کی مجالس میں حاضر ہو کر گلاس ہلا کر یا کوئی دوسرا طریقہ اظہار اختیار کر کے سوالوں کا جواب دیتا ہے۔ اس پر مرشد کریم نے بتایا کہ انہوں نے نیاز صاحب اور کرنل منظور بخشی صاحب کو اس کا طریقہ بتایا تھا کہ

کس طرح لوناگھما کر روحوں سے گفتگو کی جاتی ہے۔ فرمایا ''میں تو خیر سوگیا تھا یہ دیر تک لگے رہے تھے۔''

ایک بار مرید کو اپنے مراد کے ہمراہ کوہاٹ جانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہاں پر کرنل منظور بخش صاحب میزبانی پر مامور تھے۔ صاحب دل اور گرم جوش ان کے بارے میں مجھ سے فرمایا تھا۔ ''ان کا ان کے مرشد نے بتایا تھا کہ آپ کو ایک بندہ ملے گا جو آپ کو منزل کی طرف لے جائے گا۔ ابھی ان پر ذمہ داریاں ہیں۔ یہ ذرا فارغ ہو جائیں۔ پھر یہ سلسلے کے لئے کام کریں گے۔''

ناشتہ تیار ہونے کی اطلاع لے کر جمشید عظیمی آئے۔ ناشتے کے لئے لوازمات اور اہتمام دیکھ کر فرمایا۔ ''پہلوانوں کا ناشتہ ہے۔ میں نے جملہ کہا۔ ''ہم بھی تو پہلوانوں سے کم نہیں۔'' خودستائشی خواہ وہ مزاح ہی کی صورت ہو کوئی احسن بات نہیں۔ قدرے توقف کے بعد فرمایا۔ ربی یہودی علما کا خطاب ہے۔ اس کا مطلب ہے میرا رب۔ مولوی کا مطلب ہے میرا مولا۔ مولانا کا مطلب ہمارا مولا۔ عیسائیوں میں فادر کا لفظ Holy Father یعنی خدا سے منسوب کیا گیا ہے۔ ہندوؤں میں براہمن۔ براہما یعنی خدا سے مشتق ہے۔ یہ سب سن سن کر آخر کب تک اثر نہیں ہوگا۔'' یعنی الفاظ کے اثرات ہوتے ہیں اور ان کے اثرات ان کی تکرار کے تناسب سے بڑھتے چلے جاتے

ہیں ۔ میں نے سوچا کہ خانقاہی نظام میں القاب وآداب کے بجائے مرشد کریم اور حضور کے الفاظ مروج ہو جائیں تو یہ درست نہیں؟ حضور کا لفظ حاضر رہنے اور حاضری توجہ سے منسوب ہے۔ وہ جس کے سامنے توجہ حاضر رہے۔ اسی لئے توبات اثر کرتی ہے اور دیر تک کرتی ہے۔

فرمایا۔ ''ہر معاشرے کی اپنی روایات ہوتی ہیں۔ لوگ ان روایات کے اسیر ہوتے ہیں۔ محض اس لئے مسلمان ہوتے ہیں کہ وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس طرح آپ مسلمان ہوئے ہی کب؟ مسلمان کیلئے تو روایات کو توڑنا لازم ہے۔ ہر پیغمبر نے پچھلی روایات کو توڑا۔ اسی لئے تو جنگیں ہوئیں۔ عرب میں روایت تھی کہ اگر کسی بندے کو اس کا قبیلہ نکال دیتا تھا اور کوئی دوسرا قبیلہ اس کو امان میں نہیں لیتا تھا تو کوئی اسے پناہ نہیں ملتی تھی۔ اس کا مقدر یا تو ریگستان ہوتا اور یا پھر موت۔ حضور اکرمؐ اسی لئے طائف گئے تھے کہ ان کے قبیلے نے ان کو نکال دیا تھا وہ وہاں امان لینے ہی گئے تھے ان لوگوں نے ان کی پشت پر قبیلے کی سپورٹ نہ دیکھ کر ہی تو ان کو پتھر مارے تھے۔ ایک عیسائی غلام نے ان کو وہاں سے نکالا۔''

فرمایا۔ ''بندہ ایسے کام کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اچھے ہیں لیکن درحقیقت وہ اللہ کے نزدیک برے ہوتے ہیں اور بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ بندہ سمجھتا ہے کہ یہ

رہے ہیں۔ ہمیں کیا پتہ کہ اللہ کی پسند اور ناپسند کیا ہے؟ ہم نے نہ تو شیطان کو دیکھا ہے اور نہ ہی اللہ کو۔ ہمیں اللہ کی پہچان ہی کہاں۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ ہے لیکن یہ بات مشاہدے میں نہیں۔ مشاہدے میں تب ہی آتی ہے جب شک نہ ہو۔ یہ کتاب ہدایت دیتے ہے متقیوں کو۔ مسلمین کو نہیں۔ منافقین کو نہیں۔ کفار کو بھی نہیں۔ مشرکین کو بھی نہیں، متقی کو ہے۔ ہدایت تب ملتی ہے جب شک بھی نہ ہو اور متقی بھی ہو۔ مسلمان ہوا تو یہ ہے کہ آپ نے اللہ کو وحدانیت اور توحید کا اقرار کر لیا۔ لیکن آپ میں ایمان تب پیدا ہوتا ہے جب آپ کو یہ یقین آ جائے کہ اللہ ہے۔ اللہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔'' پھر اللہ کے دیکھنے کی کیفیت کی وضاحت کو ان پیر صاحب والا قصہ سنایا جن کے دو مرید تھے اور ان سے باری باری مرغی ذبح کرنے کو کہا۔ ایک نے کر لی اور دوسرے سے نہ ہوئی کہ اس کو ہر جگہ اللہ نظر آ رہا تھا۔ قصہ بیان کر کے فرمایا۔ ''انسان گناہ کرتا بھی تب ہے جب اسے کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔''

فرمایا۔ ''اب میں اور نیاز صاحب یہاں اس کمرے میں اکیلے ہوں اور کوئی گناہ کرنا چاہیں تو ہم پہلے تو یہ اطمینان کریں گے کہ کوئی ہمیں دیکھ تو نہیں رہا۔ دروازہ بند ہے تو بھی پردہ بھی مزید کھسکا کر درست کر لیں گے اور اگر یہ شبہ بھی ہو جائے کہ کوئی دیکھ رہا ہے تو ہم گناہ کر ہی نہیں سکیں گے اور جب بندے کے اندر یہ طرز فکر راسخ ہو جائے کہ

اللہ دکھ رہا ہے تو اس کو تو کتنا اور ثواب سے ویسے ہی نجات مل گئی۔ بھئی جب آپ نے اللہ کو دیکھ لیا پھر کسی اور کی کیا پرواہ۔

''آپ نے کبھی کسی فقیر کے بادشاہ بننے کا سنا ہے۔ آپ نے کبھی نہیں سنا ہو گا۔ پوری تاریخ انسانی میں ہے ہی نہیں۔ البتہ یہ کئی بار ہوا ہے کہ بادشاہوں نے بادشاہت چھوڑ کر فقیری اپنا لی۔ اس لئے کہ وہ حقیقی بادشاہ اور اس کی بادشاہت سے واقف ہو گئے۔ حقیقی بادشاہ سے مل لینے کے بعد تو ہر بادشاہت ہیچ ہو جاتی ہے۔

اپنی تربیت کے ایک مرحلے کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''حضور قلندر بابا اولیاؒ نے مجھے سترہ دنوں کا روزہ رکھوایا۔ اس دوران پتی کے بغیر چائے اور کافی کے علاوہ اور کچھ لینے کی اجازت نہ تھی۔ جب میری والدہ نے مجھے دیکھا تو میرے کمزوری دیکھ کر وہ بہت ناراض ہوئیں اور حضور قلندر بابا اولیاؒ سے خفا ہو گئیں کہ انہوں نے ان کے بچے پر ظلم کیا۔''

حضور کوئی کام کہتے تھے تو ساتھ میں تصرف بھی فرماتے تھے کیونکہ میں نے دیکھا کہ اگر انہوں نے کہا کہ روزہ رکھو تو بھوک ہونے کے باوجود کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بھوک میں جو کیفیت ہوتی ہے۔ وہ سب ہوتی تھی مگر پھر بھی کھانا کھانے کی طلب نہیں ہوتی تھی۔''

’’آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں ۔ بھوک کی اپنی ایک لذت ہوتی ہے ۔ روزوں کے بعد یہ لذت باقاعدہ یاد آتی ہے ۔ ان دنوں مجھے یہ دیواروں چکنے کاغذ کی مانند نظر آتی تھیں ۔ چھت بھی ایسے ہی نظر آتی تھی جیسے کاغذ کی بنی ہوئی ہو ۔ اور باہر کے عکس ان پر پڑ رہے ہوں ۔ اسی دوران پھر حضور نے اس کیفیت سے گزارا کہ میں دیکھتا کہ ایک کمرہ ہے اس میں الماریوں میں سونا بھرا ہوا ہے میں اس کمرے میں بند ہوں ۔ بھوک میں آواز آتی سونا کھاؤ ۔ پھر دیکھا کہ ایک کمرہ ہے اس میں چاندی بھری ہوئی ہے ۔ بھوک محسوس ہوتی تو آواز آتی چاندی کھاؤ ۔ اسی طرح یہ دکھایا کہ ایک کمرہ میں لوٹ ہی لوٹ بھرے ہیں آواز آتی لوٹ کھاؤ لوٹ ۔

جب روزہ مکمل ہو گیا تو آنتیں خشک ہو گئی تھیں ۔ مجھے پہلے روغن بادام گرم دودھ میں ڈال کر دیا گیا ۔ پھر دودھ کے ساتھ نرم غذائیں دی جانے لگیں اور اس طرح رفتہ رفتہ واپس اس خوراک پر ڈالا گیا ۔ اس سے

خاندان والوں سے کہا میں دیکھ لینے کے بعد کیسے پھر جاؤں ۔‘‘

فرمایا ۔ ’’حضور قلندر بابا اولیاؒ نے میری بڑی کڑی نگرانی کی ۔ میری تربیت کے مراحل میں میرے ساتھ خود بھی سختی جھیلی ۔ حضور نے میرے تربیت لاشعوری طور پر

کی اور میرے لاشعور کی تربیت کی۔ اب سلسلے میں جن کی تربیت کی جاتی ہے ان کے شعور پہ ضرب لا کر اس کو لاشعور سے جوڑ دیا جاتا ہے۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تربیت میں وہ سخت مراحل جن سے مرشد کریم خود گزرے ان کے مریدوں کو اتنی شدت سے درپیش نہ ہوں گے ان کو انہی مراحل سے ان کے ذہن کی سکت کے مطابق گزار دیا جائے گا جن سے مرشد کو گزارا گیا تھا۔ شاید اس لئے کہ ان کے مریدوں کو کونسا لاکھوں انسانوں کو تربیت دینا ہوگی۔ ان کو تو لاکھوں افراد کے قافلے کو اپنے ساتھ لے کر میر کارواں کی طرح انفس و آفاق کی گھاٹیوں سے گزارنا اور دشت زیست کی چیرہ دستیوں سے بچانا تھا۔ اس لئے ان کی تربیت کی نہج ہی کچھ اور انداز کی تھی۔

اس بات کا تذکرہ میرے مراد نے کئی بار جلوت و خلوت میں فرمایا کہ ان کو یہ سعادت حاصل رہی کہ ان کے مرشد کریم نے ان کی تربیت کی خاطر چودہ پندرہ سال کے یہاں قیام کیا۔ اس بات پہ میرے مراد کو بہت ناز ہے۔ ایک بار محبت و عشق کا تذکرہ فرماتے ہوئے بتایا کہ پیار دیکھ کر

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے پیار کیا۔" اور مجھے عرس کی رات کے خطاب میں کہے ہوئے اپنے مراد کے وہ الفاظ یاد آ گئے کہ آپ کو مجھ سے پیار کا دعویٰ ہے تو آپ مجھے یہ بتائیں

کر لو ہے کو مقناطیس کھینچتا ہے یا مقناطیس لو ہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ آپ مجھ سے اس لئے پیار کرتے ہیں اور مجھ میں کشش محسوس کرتے ہیں کہ میں آپ سے پیار کرتا ہوں۔ آپ مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز ہیں۔ آپ میں ہی میری روحانی اولاد ہو اسی رشتے سے میں آپ سے پیار کرتا ہوں۔

یہ سن کر مجھ کو یوں محسوس ہوا کہ ماں کی محبت اور ممتا کا نور ہمارے ارد گرد پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ ذہن میں ایک تصویر ابھری ایک بچہ ہے جو ماں کی گود میں ہنس کھیل رہا ہے۔ ماں کا چہرہ اس پر جھکا اور تبدیل ہو کر مرد کے روپ میں ڈھل گیا۔ میں نے چونک کر اپنے مراد کو دیکھا ممتا کا نور انہی کے چہرے سے تو پھوٹ رہا تھا۔ محبت بھی کیا چیز ہے۔ کہیں ماں اور کہیں مراد او ر روپ بہروپ کے اس پردے میں وہ ہستی چھپی ہوئی ہے جو اظہار ممتا کو ستر ماؤں سے زیادہ بڑھ کر ہے۔

عرس میں شرکت کے بعد رخصت ہونے کی اجازت لینے میں اپنے مرد کے سامنے حاضر ہوا تو عرس کے شاندار انتظامات پر بات ہوئی۔ فرمایا ''اس بار سب لوگ جو یہاں آئے، خوش ہو کر گئے۔ ان کو خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہوا۔ اب اگر وہ ہزار آدمی تھے اور ہزار آدمی خوش ہوئے اور میں ہر فرد کو خوش دیکھ کر خوش ہوا تو میرے خوشی ہزار افراد کے برابر ہوئی یعنی اس طرح میری خوشی Multiply ہو گئی۔'' خوشی کو ہزاروں اور

لاکھوں گنا کرنے کا یہ نکتہ تعلیم کرنے سے پیشتر اس بات کا اہتمام کیا کہ اس کا عملی مظاہرہ ہو۔ بے شک خانقاہی نظام تدریس میں عمل پہلے اور علم بعد میں آتا ہے۔ یہاں ہر بات خالص ترین حالت میں کہی جاتی ہے اور اسی قدر اخلاص سے آراستہ سماعتوں کی متقاضی ہوتی ہے۔ خلوص ہی کا ایک سا خشانہ سورہ اخلاص بھی تو ہے۔ اسی خلوص کی لہر خلوص نیت سے لے کر خلوص عمل تک جاری ہو جائے تو آدمی انسان بن جاتا ہے اور انسان ہی بندہ بنتا اور بناتا ہے۔

اپنے مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا ایک واقعہ سنایا کہ حضور رات بھر جاگتے اور تکوینی کاموں میں مصروف رہتے۔ صبح اذان کے بعد میں ان کو چائے پیش کیا کرتا۔ ایک بار جب میں چائے لے کر حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضور کے چہرے سے مسرت پھوٹی پڑ رہی ہے۔ میں نے عرض کی۔ ''حضور آج آپ بہت خوش ہیں۔'' فرمایا '' خواجہ صاحب آپ سمجھیں گے بھی یا نہیں۔ رات اللہ سے ملاقات ہوئی مجھے لگا کر کہا۔ کہ میری جان تو کہاں ہے؟''

میرے ذہن میں تجسس لہرایا۔ اس نے سوال کیا۔ ''حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے یہ کیوں فرمایا کہ آپ سمجھیں گے بھی یا نہیں؟'' جواب میں ارشاد ہوا۔

''بھئی یہ الہامی انداز کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی بار قرآن میں فرمایا۔'' وا

اور کسی بات کو سمجھانے اور متوجہ کرنے کے لئے ہی تو کہا جاتا ہے کہ ''تم کیا سمجھے؟
تم سمجھو گے نہیں۔'' اس آیت کی وجہ تسمیہ بھی صاف ہوئی۔

میں نے دوسرا سوال عرض کیا۔ ''اور حضور سے یہ کیوں کہا کہ تو کہاں ہے؟''

یعنی کیا اللہ کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضور کہاں ہیں۔ اس پر میری سوچوں کی حدود سے ماورا سطح رکھنے والے سراد نے انتہائی سادگی اور بھولپن کے انداز میں وضاحت کی۔ ''یہ پیار کا طرز تخاطب ہے۔ جب آپ کسی عزیز دوست سے ملتے ہیں۔ خواہ کچھ ہی دیر پہلے اس سے مل چکے ہوں آپ کہہ گزرتے ہیں۔ ''اماں یار کہاں ہو تم؟''

میں نے اپنے ذہن میں ان دوستوں کو یاد کیا۔ جن کے لئے خود اس نے یہ جملہ کہا تھا اور حیران ہوا کہ یہ محبت یار کی طلب ہی تو تھی جو یہ جملہ کہلواتی ہے۔

نور حسن جان صاحب بھی ملاقات کے لئے آئے تھے۔ باتوں کے دوران انہوں نے نیاز صاحب کی چارسدہ پوسٹنگ ہونے کی بات کی اور کہا کہ آپ دعا کریں کہ نیاز صاحب کی پوسٹنگ واپس پشاور ہو جائے۔ اس سے یہاں کے کاموں میں مدد ملے گی۔ سن کر ایک لحظہ توقف کیا اور پھر ارشاد فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ ایک آدمی جگہ خالی کرتا ہے تو اس کی جگہ چالیس آدمی اس جگہ کو پر کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اب یہ ایک الگ بات ہے کہ اس کی جگہ پہلے سے بہتر آدمی آتا ہے!

نہیں ۔یہ قانون ہے ۔فرمایا ’’نیاز بھائی کو آرام ملے گا اور یہاں کے لڑکوں کو خود کام کا نا پڑے گا تو ان کی تربیت ہوگی۔‘‘

آج چارسدہ جانا طے تھا۔ چارسدہ کے لئے روانہ ہوئے۔ چارسدہ پشاور کے قریب ضلع مردان کی ایک تحصیل تھی آج کل ضلع ہے۔ پشاور سے وہاں تک دہرے سڑک ہے۔راستے میں بخشی پل ہے یہاں کے چپل کباب بہت مشہور ہیں۔مردان اور پشاور سے لوگ یہاں صرف چپلی کباب کھانے آتے ہیں۔اس سے آگے نا گمان کا پل ہے جو دریائے کابل پر بنا ہوا ہے۔اس پل کے قریب تازہ مچھلی کی دکانیں ہیں آپ خرید کر گھر لے جائیں یا وہیں تلوا کر کھائیں۔پکنک کی پکنک اور سفر کا سفر۔راستے کے دونوں طرف زیادہ تر گنّے کے کھیت ہیں۔گنا اور تمبا کو اس علاقہ کی نقد آور فصلیں ہیں اور اس علاقے کی زرخیزی تو دور تک پھیلے سبزے کی گہری رنگت سے ہی ظاہر ہو رہی تھی۔

چارشدہ ایک تاریخی قصبہ ہے۔یہ زمانہ قبل مسیح میں بھی اس مقام پر موجود تھا۔اس کا قبرستان پاکستان کے قدیم ترین قبرستانوں میں شمار ہوتا ہے۔اس کے بازار سے گزرے تو نیاز صاحب نے بتایا کہ یہاں کی پشاوری چپلیں بہت مشہور ہیں۔

چارسدہ میں ایک شوگر مل اور ایک پیپر مل ہے۔ یہاں کی پیپر مل ایشیا بھر کی سب سے بڑی پیپر مل ہونے کے باوجود ملکی ضروریات کی مطابق کاغذ پیدا نہیں کر رہی۔ وجہ وہی کہ انتظام دیانت کا متقاضی ہے اور وہی نایید ہے۔ اردگرد کے علاقوں میں تمباکو نہ صرف نقد آور جنس کے طور پر اگائی جاتی ہے بلکہ اس کی کھپت کے لئے کئی ایک سگریٹ فیکٹریاں بھی یہاں قائم ہیں اور بعض مشہور فیکٹریوں کے کئی کئی گودام ہیں۔ صوبہ سرحد کے کئی مشہور سیاسی لیڈر بھی اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے اس کا نام پشکلاوتی تھا بعد میں ہشت نگر کہلایا اور آج کل ان چار دریاؤں کی مناسبت سے اس کو چارسدہ کہتے ہیں جو اس خطہ ارض میں سے گزر کر دریائے کابل میں جا گرتے ہیں۔

پشاور مردان روڈ پر واپڈا کے ایک تربیتی سنٹر کی عمارت میں نیاز صاحب کی رہائش گاہ پر اترے۔ اس وقت تک ہمارے ذہن میں یہی تھا کہ نیاز صاحب مرشد کریم کو اپنا گھر دکھانے لا رہے ہیں۔ مگر وہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ انہوں نے وہاں کچھ ہی عرصے میں کس قدر کام کر لیا ہے۔ تین چار سو آدمی ان کے مرشد کریم سے ملنے، انہیں دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر کے لان ہی میں سب کے بیٹھنے کا بندوبست کیا اور شام بعد از نماز مغرب اپنے مرشد کے خطاب کا پروگرام ترتیب دے دیا۔ کچھ لوگ روایتی انداز کے پیر صاحب کو ذہن میں رکھے، وہاں آئے تھے تو کچھ ان کو

ایک عظیم روحانی ہستی مان کر۔ کچھ نیاز صاحب سے سنی ہوئی باتوں کی تصدیق کرنے اور کچھ محض ایک ولی اللہ کی زیارت کرنے۔ کچھ ان سے اپنے دکھوں کا درماں کروانے اور کچھ ان کے علم سے آگاہی حاصل کرنے۔ کچھ ایک اس تاڑ میں تھے کہ یہ کوئی قابلِ گرفت بات کہیں تو وہ اس کی پکڑ اور تکذیب کریں۔

میں نے اس دیہاتی سے ماحول میں اپنے مرادکو لوگوں سے ملتے ان کی باتیں سنتے ان کے علاج تجویز کرتے ہوئے دیکھ کر سوچا کہاں امریکہ اور برطانیہ کی یونیورسٹیوں کے ریسرچ سکالروں سے علمی گفتگو اور کہاں صوبہ سرحد کے ایک قصبے میں اپنے مشن کی ترویج کی کوششیں، یہ سب انہیں کا جگرا ہے۔ مجھ کو اپنے مراد کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی۔ وہ اپنے دورہ یورپ کے تاثرات بتا رہے تھے۔ فرمایا۔ ''وہاں جتنے بھی لوگ ملنے آئے سب نے علمی نوعیت کے سوال پوچھے۔ یہاں جو آتا ہے پیٹ درد اور خانگی الجھنوں میں ہی گھرا ہوتا ہے۔''

اور بتایا کہ انگلینڈ میں ایک صاحب ملنے آئے۔ وہ آواگون پر ریسرچ کر رہے تھے۔ انہوں نے آواگون (Reincarnation) کے 2500 کیس اسٹڈی کئے تھے۔ ان سے مترجم کے ذریعے کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک بات چیت رہی۔ وہ اس نظریئے کے بارے میں ان کا نکتہ نظر جاننے کا متمنی تھا۔ فرمایا۔ ''میں نے ان سے

دریافت کیا کہ آپ نے جو کیس دیکھے ہیں ان میں کس عمر کے لوگ دوبارہ جنم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ 8 سال کی عمر تک کے بچے، اور یہ بھی بتایا کہ انہوں نے بعض کیسوں میں اگلے جسموں پر وہی نشان تک دیکھے ہیں جو مرے ہوئے آدمی کے جسم پر ہوا کرتے تھے اور انہیں یہ دعویٰ ہوتا تھا کہ وہ اسی مرے ہوئے آدمی کا دوسرا جنم ہیں۔ اس پر میں نے ان سے کہا۔ اس سے بات اور بھی صاف ہوگئی۔ دیکھیں انسان کا اس دنیا میں آنا آدم کا ریکارڈ ہے۔ یہ وہ ریکارڈ ہے جو انسانی لاشعور کو فیڈ ہوتا ہے اور انسانی لاشعور کی مشین اس ریکارڈ کو ایک پرنٹنگ مشین کی طرح چھاپ رہی ہے۔ جب ایک انسان کا ریکارڈ کسی دوسرے انسان کے ریکارڈ سے مکس ہو جاتا ہے تو اس قسم کے مظاہرے سامنے آتے ہیں جس قسم کے آپ نے اپنے کیسوں میں اسٹڈی کیے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں دوبارہ آنے کا دعویٰ کرنے والا بچہ 8 سال کی عمر کے بعد جب اس کا دنیاوی شعور توانا ہونا شروع ہو جاتا ہے تو وہ اس دعویٰ سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ اس پر جب ان صاحب نے جسمانی نشانات کے حوالے سے اپنی بات پر اصرار کیا تو میں نے ان سے کہا کہ یہ نشانات ہی تو میری بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ پہلے ایک شخص کا ریکارڈ بنا۔ جب لاشعور کی مشین پر دوسرا شخص چھپ رہا تھا تو اس وقت سابقہ ریکارڈ کا عکس اس پر پڑا اور وہ نشانات جو پہلے والے ریکارڈ میں موجود تھے اس پر بھی چھپ

گئے۔" ان صاحب کی بابت یہ تبصرہ بھی کیا کہ وہ یہ مانتے تھے کہ آپ کی بات میں وزن ہے میں اس پر سوچوں گا لیکن میں ان ڈھائی ہزار کیسوں کا کیا کروں جو میں خود تلاش کر کے دیکھ چکا ہوں۔ اصل میں ان کا ذہن اس نتیجے سے ہٹنے پر تیار نہیں تھا جو انہوں نے اتنی محنت اور ریسرچ کے بعد اخذ کر لیا تھا۔"

انگلینڈ ہی میں کسی سائنس دان سے اپنی گفتگو کے حوالے سے بتایا تھا کہ "وہ لوگ خدا کو نہیں مانتے۔ الیکٹرون کو مانتے ہیں حالانکہ وہ بھی تو نظر نہیں آتا۔ عجیب بات ہے الیکٹرون کو، جو غیب ہے مان لیں گے، خدا کو نہیں مانیں گے۔ بھئی اگر ان دیکھی چیز ہی کو ماننا ہے تو خدا ہی کو کیوں نہیں مان لیتے۔"

انگلینڈ میں جن کے ہاں ٹھہرے وہ میرے مراد کو اپنے ایک جاننے والے سے ملوانے لے گئے۔ ان کو وہاں چھوڑ کر وہ خود کسی کام سے چلے گئے۔ جن کے گھر گئے وہ صاحب انہیں اپنے عالی شان، سجے ہوئے، انتہا درجے کی امارت میں بڑھے ہوئے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خود اپنے شغل میں مصروف ہو گئے۔ فرمایا۔ "میں کرسی گھما کر ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ اس پر شاید انہیں احساس ہوا کہ انہیں ایسے رویے کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ میرے پاس آئے اور کہا کہ میں نے آپ کو اتنے قیمتی قالین پر بٹھایا، اس قالین کی قیمت یہ ہے، اس صوفے کی یہ قیمت ہے، اس ڈرائنگ روم کی سجاوٹ پر میں

نے اتنے پاؤنڈ خرچ کیئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ یہ قالین کتنا بھی قیمتی ہو اس کو رہنا بہر حال پیروں کے نیچے ہی ہے اور جس چیز کا مقام پیروں کے نیچے ہو وہ بیش قیمت ہو کر بھی قیمتی نہیں رہتی۔"

میں انہیں سوچوں میں غلطاں واپڈا ٹریننگ سنٹر کی طرف نکل گیا۔ نیاز صاحب آج کل وہاں پہ بطور ڈپٹی ڈائریکٹر تعینات تھے۔ اس سنٹر میں محکمہ برقیات کی برقی تاروں کی دیکھ بھال اور ان کے کھمبے بچھانے سے لے کر ان کو گرڈ سٹیشن سے ملا نا تک سیکھنے والے کارکنوں کو تربیت بھی دی جاتی ہے۔ ایک وسیع قطعہ اراضی کے گرداگرد عمارت بنائی گئی ہے۔ پوری عمارت دومنزلہ تھی۔ ایک طرف دیوار، ایک طرف سنٹر کے کارکنوں کے رہائشی مکان، سنٹر میں داخلہ اس رہائشی حصے کی طرف سے تھا اور دائیں طرف والی عمارت میں کلاس اور پرنسپل کے دفتر کے لئے کمرے تھے۔ اس کے پہلو کی عمارت ہوسٹل تھی۔ جہاں تین چار بلاک بنے ہوئے تھے۔ آج کل وہاں کوئی طالب علم رہائش پذیر نہ تھا۔ اس عمارت کی درمیانی کھلے حصہ میں کھمبے، ٹرانسفارمر، تاروں کے دیو ہیکل بنڈل اور چند ایک ٹرک وغیرہ کھڑے تھے۔ یہ سنٹر بیک وقت سٹور ہاؤس بھی تھا۔

مرشد کریم کی طرف سے چائے کا بلاوا سن کر ہی طبیعت میں چستی سی دوڑ

گئی۔صرف یہ کہہ دیا جاتا کہ آ کر چائے پی لیں تو ایک بات ہوتی۔ جا کر چائے پینے میں نہ کوئی ندرت ہوتی اور نہ ہی کوئی خاص بات۔ ''بابا جی! آپ کو چائے کے لئے اندر بلا رہے ہیں۔'' سن کر چستی آنے کا تعلق چائے کی بجائے اس خیال کے سبب تھا کہ مرشد کریم نے ہمیں یاد فرمایا تھا۔ تعلق کس کس طرح سے اظہار میں آتا ہے اور محسوس ہوتا ہے یہ بات بھی بیان سے زیادہ محسوسات سے ہی تعلق رکھتی ہے۔

چائے کے دوران سہ پہر کے وقت گھروں سے باہر نکلنے کی خواہش کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا۔'' آپ دیکھیں کہ اس وقت گھروں اور کمروں میں دم گھٹنے لگتا ہے۔ کمرے میں ہوں تو باہر صحن میں نکلنے کو جی چاہتا ہے۔ گھر میں ہوں تو گھر سے باہر جانا اچھا لگتا ہے۔ آپ دیکھیں اس وقت لوگ گلیوں اور بازاروں میں نکل آتے ہیں۔'' پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔'' دراصل اس وقت شعور لاشعور میں ڈھلتا ہے اور انسان کو گھبراہٹ ہوتی ہے۔ دن کے حواس رات کے حواس میں ڈھل رہے ہوتے ہیں تو انسان ہی کیا پرندے، جانور اور کیڑے مکوڑے تک اس تبدیلی کی زد میں ہوتے ہیں۔ وہ بھی باہر نکلتے ہیں۔'' انداز بیان میں اتنی تاثیر کہ ہم چشم تصور سے شام کے وقت بھرے ہوئے بازاروں کو دیکھتے رہے۔ ذہن میں انہی اوقات میں عصر، مغرب اور عشاء کے اوقات الصلوٰۃ کی اہمیت کا بھی خیال آیا۔ اچھا تو یہ بات ہے، مرید کو جیسے کسی دیرینہ

سوال کا جواب خود بخود ہی مل گیا۔

سحر خیزی اور اوقات تہجد کی اہمیت کو واضح کرنے کو ارشاد فرمایا۔ ''اور تو اور یہ درخت بھی مراقبہ کرتے ہیں۔ رات دو ڈھائی بجے یہ سب چیزیں نیند سے بیدار ہوتی ہیں اور پھر دوبارہ مراقب ہو جاتی ہیں اور سحر ہونے تک مراقبے میں رہتی ہیں۔''

ایک عورت کی بابت بتایا کہ وہ ملنے آئی اور بے چینی اور بے سکونی کی شکایت کر کے علاج کا کہنے لگیں۔ میں نے پوچھا کیا گھر نہیں؟ کہا کہ پورے ہزار گز پر کوٹھی ہے۔ پوچھا، کیا گاڑی نہیں ہے کہا ایک چھوڑ دو دو گاڑیاں، پوچھا کہ اولاد نہیں ہے تو اس پر کہا اولاد بھی ہے۔ بچے خیر سے سکول اور کالج جا رہے ہیں۔ پڑھ لکھ رہے ہیں۔ پوچھا کیا خاوند کے روزگار کا کوئی مسئلہ ہے۔ بتایا کہ خاوند کا اپنا کاروبار ہے اور خوب اچھا چل رہا ہے۔ فرمایا۔ ''بظاہر انہیں کوئی بیماری بھی نہ تھی اب آپ اندازہ کریں کہ ایسی عورت کو بھلا کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔'' پھر خود ہی ارشاد فرمایا۔ ''دراصل لوگوں کو خوش رہنا ہی نہیں آتا۔''

جب دیکھا کہ ہمارے ذہن میں بات اس طرح سے نہیں آ رہی جس طرح سے آپ سمجھانا چاہ رہے ہیں تو کہا۔ ''کسان کھیت میں دانہ ڈالتا ہے۔ وہ دانا مٹی ہو جاتا ہے تو ایک نیا پودا نکلتا ہے۔ اب اس پودے پر جو دانے لگتے ہیں۔ آپ ان کو شمار کر کے

دیکھیں گندم کی بالیں، چاول کے دانے یا بیری کے بیر گن کر دیکھیں۔ اللہ ایک دانہ مٹی میں پھینکنے کے عمل کو کتنا بڑھا دیتا ہے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ سب کے ذہنوں سے اللہ تعالیٰ کے افزودنی عطا کرنے کے نظام کا نظارہ گزرتا چلا گیا۔ اس افزائش کے عمل کا تعلق کہیں استغنا سے ہی تو نہیں جڑا ہوا۔ یہ سوچ کر میں نے سوال پوچھا۔ "کیا دانے کو، مٹی میں پھینکنے کے عمل کو استغنا کہہ سکتے ہیں؟"

فرمایا۔ "جی نہیں۔ یہ توکل ہوا۔ آپ نے دانہ مٹی میں اس بھروسے پر پھینکا کہ اللہ اس میں اضافہ کر کے لوٹا دے گا۔"

پوچھا کہ حضور تو پھر توکل اور استغنا میں کیا فرق ہے؟

فرمایا۔ "توکل یہ ہے کہ اللہ نے چاہا تو کر دے گا اور استغنا۔۔۔ استغنا یہ ہے کہ اللہ چاہے کرے، چاہے نہ کرے۔" "نہ کرے" کہتے ہوئے ہاتھ بلند کر کے، سر سے اونچا اٹھا کر ہلایا۔ اس انداز میں کہ ہاتھ بلندی پر پہنچ کر کہنی اور کلائی تک ساکت رہا صرف انگلیاں اور ہتھیلی گردش کر کے رہ گئیں۔ ذہن میں آیا کہ اپنی مرضی کو اولیت دیتے ہوئے اللہ پر بھروسہ کرنا ایک ادنیٰ درجے کی بات ہے اور لغت میں اس کو توکل کہتے ہیں لیکن اپنی مرضی ختم کر دینا اور اللہ کی مرضی کو اولیت دینا اعلیٰ صفت ہے اور اگر یہ اندازِ نظر

حاصل ہو جائے تو کیا کہنا۔فرمایا۔''آپ قلندر شعور پڑھا کریں۔''

کچھ لوگ ملنے آ گئے۔انہوں نے نیاز صاحب کی تعریف کی کہ وہ بہت اچھے انسان ہیں نیاز صاحب نے عاجزی سے کہا، یہ تو میرے مرشد کی عنایت ہے کہ انہوں نے مجھے ایسا بنا دیا ہے۔اس پر تبسم ریز لہجے میں فرمایا۔''نیاز صاحب خوش ہیں کہ انہیں مجھ سا مرشد ملا اور میں خوش ہوں کہ مجھے نیاز بھائی جیسا مرید ملا۔یوں ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے خوش ہیں۔''

****